ISSN: Print: 2521-8204
Online:2616-9681
شمارہ نمبر:۶ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء

تحقیقی و تنقیدی مجلّہ

# تحقیقی جریدہ

شعبہ اُردو
جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

بسم الله الرحمن الرحيم

**تحقیقی و تنقیدی مجلہ**

# تحقیقی جریدہ

**شمارہ: ۶ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء**

**سرپرست اعلیٰ**

پروفیسر ڈاکٹر رخسانہ کوثر

(وائس چانسلر)

**نگران**

پروفیسر نائلہ ارشد

انچارج کلیہ فنون و سماجی علوم

**مُدیر**

ڈاکٹر محمد افضال بٹ

صدرِ شعبہ اُردو

**معاونین**

ڈاکٹر سبینہ اویس، ڈاکٹر شگفتہ فردوس،ڈاکٹر طاہر طیب

**شعبہ اُردو**

**جی سی ویمن یونیورسٹی،سیالکوٹ**

**ISSN Print:** 2521-8204**, Online:** 2616-9681

## مجلس مشاورت: قومی

- پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی ڈائریکٹر مجلسِ ترقی ادب، لاہور
- پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
- پروفیسر ڈاکٹر رشید امجد سابق عمید( ڈین )کلیۂ زبان وادب،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
- پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف خشک پرو وائس چانسلر ، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور (سندھ)
- پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس صدرِ شعبہ اُردو، جامعہ کراچی، کراچی
- ڈاکٹر ناصر عباس نیّر ڈائریکٹر جنرل، اُردو سائنس بورڈ، لاہور
- پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز صدرِ شعبہ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

## مجلس مشاورت: بین الاقوامی

- پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم صدر شعبہ اُردو، الازہر یونیورسٹی، قاہرہ، مصر
- ڈاکٹر خلیل طوق آر صدر شعبہ اُردو، انقرہ یونیورسٹی، استنبول، ترکی
- پروفیسر ڈاکٹرخواجہ محمد اکرام الدین جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نیو دہلی، انڈیا
- پروفیسر سویا مانے یاسر شعبہ ایریا سٹڈیز(ساؤتھ ایشیاء)، اوساکا یونیورسٹی، جاپان
- ڈاکٹر محمد کیو مرثی صدر شعبہ اُردو، تہران یونیورسٹی، ایران
- پروفیسر چویوان صدر شعبہ اُردو بیجنگ فارن سٹڈیز یونیورسٹی، چین
- ڈاکٹر تمثال مسعود ڈیپارٹمنٹ آف ایشین سٹڈی،دی یونیورسٹی آف ٹیکساس، آسٹن،امریکہ



ناشر: جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

رابطہ:شعبہ اُردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ، فون نمبر:138-192-9250137-052

ویب سائٹ: www.gcwus.edu.pk/tahqeeqijareeda Email:tjurdu@gcwus.edu.pk

قیمت شمارہ:۳۰۰

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| • حرفِ آغاز | مدیر | |
| • سر سید احمد خان کی تعلیمی وسیاسی بصیرت اور عصری شعور | ڈاکٹر شبنم نیاز / سحر مبین | ۱ |
| • جدید اردو نظم میں اساطیری حوالے | ڈاکٹر ارم صبا / ڈاکٹر شگفتہ فردوس | ۱۲ |
| • سرائیکی سہ حرفی موضوعاتی مطالعہ | امجد رضا / ڈاکٹر طاہر عباس طیب | ۲۳ |
| • عرب دنیا میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال | پروین صادق | ۳۷ |
| • کلثوم افضل زیدوی کے شعری مجموعہ 'سنگتارے' کا فکری مطالعہ | ڈاکٹر تحسین بی بی / اعظمی نورین | ۴۷ |
| • ڈاکٹر ارشاد شاکرؔ اعوان کی نظموں کا موضوعاتی مطالعہ | محمد ناصر آفریدی / انجم یوسف | ۶۳ |
| • عربی شعرا کے قتل کے اسباب (عہد جاہلیت تا عہد عباسی) | ارشد محمود / ڈاکٹر محمد اسماعیل بن عبدالسلام | ۷۷ |
| • ٹالسٹائی کی منتخب کہانیوں میں فکری سطح پر معاصر روسی تمدن کی بازیافت | ڈاکٹر نقیب احمد جان / منزہ مبین | ۱۰۱ |
| • ڈاکٹر انوار حمد کی افسانہ نگاری | شکیل حسین سید | ۱۱۳ |
| • نصیر احمد ناصر کی نظموں میں جدید دور کے مسائل | مہناز انجم | ۱۲۵ |
| • سیرت رسولِ صادق کا تجزیاتی مطالعہ | عثمان غنی رعد / محمد ابرار صدیقی | ۱۳۵ |
| • محمد طفیل کی خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کے عناصر | ڈاکٹر صائمہ نذیر / حامد محمود | ۱۴۳ |
| • ظفر علی خان کے اخبارات و رسائل: تحقیقی مطالعہ | محمد ابرار ارشد / ڈاکٹر محمد افضال بٹ | ۱۵۵ |
| • محمد اقبال نجمی کی حمد نگاری | احسان اللہ طاہر / بابر حسین | ۱۷۷ |
| • ثانوی سطح پر پنجابی طلبہ کی انگریزی اور اردو میں تحریری اغلاط کا تقابلی جائزہ | ڈاکٹر محمد راشد حفیظ / ڈاکٹر محمد شہباز / ڈاکٹر علی احمد | ۲۰۱ |
| • انڈیکس | مس اعظمی نورین | ۲۱۷ |

# حرفِ آغاز

"تحقیقی جریدہ" کا چھٹا شمارہ پیش خدمت ہے۔ اہل علم نے پہلے پانچ شماروں کو جو پذیرائی دی ہے اس کے لیے ہم تمام احباب کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ یہ شمارہ اپنی شناخت اور روایت کو برقرار رکھے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے معیار میں بہتری آتی رہے۔

"تحقیقی جریدہ" کا یہ شمارہ حسب معمول یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔

مدیر

ڈاکٹر شبنم نیاز
استاد شعبہ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور
سحر مبین
اسکالر، پی ایچ۔ڈی، شعبہ اُردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

# سر سید احمد خان کی تعلیمی وسیاسی بصیرت اور عصری شعور

## Sir Syed Ahmad Khan's Educational and Political Insight and Consciousness of His Times

Sir Syed Ahmad Khan is a renowned researcher, editor, translator, philosopher and founder of Aligarh College. He was the master in oriental and western science. He observed western culture very closely and after, he made up his mind that if Muslims want to compete with Global powers of their age, they have to embrace the concepts of western materialistic science. He earned a lot of respect in different aspects of creative work like research, criticism, history, biography translation editing and prose. This article consists of an account of his work as well as analysis of his services for Indian Muslims and Urdu literature.

**Keywords:** Renowned, Researcher, Translator, Philosopher, Global, Aspects, Literature.

کسی بھی ملک کے سیاسی، سماجی، معاشی، ذہنی، ادبی، علمی اور ثقافتی رجحانات اس سرزمین کے حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ برصغیر کے معاشرے کی بھی یہی صورت حال تھی کہ یہاں کا معاشرہ مختلف قوموں میں بٹے ہونے کے ساتھ ساتھ دو بڑی قوموں میں منقسم تھا۔ ایک مسلم معاشرت اور دوسری ہندو معاشرت یہ ہر دو بڑی قوتیں نہ صرف مذہب بلکہ تہذیب، زبان، عقائد، رسم و رواج، تاریخ اور طرز زندگی میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ یہ بڑا تفاوت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ابھر کر سامنے آیا جس نے ہندوستان کی تاریخ ہی بدل دی۔ اسی فرق نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر اور بغاوت کا نام دیا۔ اس واقعے نے ہندوستان کے ہر خاص و عام اور تمام شعبہ زندگی کو متاثر کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد علمی و ادبی میدان کے علاوہ ملکی سیاست میں جو مسلم شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہوئی وہ سر سید احمد خان کی ہے۔ سر سید احمد خان وہ تاریخی شخصیت ہیں جنہوں نے اکبر شاہ ثانی کا دور بھی

دیکھا اور بہادر شاہ ظفر کے عہد زوال کے بھی گواہ ہیں لیکن سر سید کا غالب رجحان انگریز پالیسیوں اور جدید تعلیم کی طرف تھا۔ ان کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کے تشخص اور وقار کو پہنچا ہے۔ اگر مسلمانان ہند اپنا کھویا ہوا تشخص اور وقار دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس عہد کے تقاضوں کے مطابق قدم سے قدم ملا کر چلنا ہو گا۔ سر سید احمد خان انیسویں صدی کے ان عظیم رہنماؤں میں سے تھے جن کی جدوجہد سے ہندوستانی قوم کی صد سالہ کشمکش ایک منطقی انجام تک پہنچی۔ ان کی شخصیت میں ہمیں ایسے انسان کی جھلک نظر آتی ہے جس نے اپنی ان تھک بے لوث مساعی اور تحریروں سے ایک شکست خوردہ قوم میں اعتماد اور یقین کی وہ روح پھونکی جس نے بالآخر استعماری طاقتوں اور عیاریوں کو شکست دی۔ انہوں نے ہندوستانی قوم میں از سر نو اعتماد بحال کرنے کی جس جدوجہد کا آغاز کیا وہ بخیر وخوبی پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اس جدوجہد کے صلے میں لوگوں کے طعن، تذلیل، پھبتیوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں کافر، ملحد، کرسٹان اور نہ جانے کیا کچھ کہا گیا مگر انہوں نے خلوص دل سے اپنے کام کو جاری رکھا۔

مولوی سید اقبال علی سر سید احمد کی بے لوث مساعی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ سچ ہے کہ کوئی قوم اور کوئی رفارمر کسی زمانے میں ایسا نہیں گزرا کہ جس کے ساتھ اس زمانے کے لوگوں نے بد سلوکی نہ کی ہو اور اس کو لعنت وملامت کا نشانہ نہ بنایا ہو مگر اسی زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو ان کی نہایت قدر کرتے تھے اور ان کی کوششوں میں شریک بھی ہوتے تھے۔ ہم کو خیال تھا کہ یہ زمانہ صرف پہلی قسم کے لوگوں سے بھرا ہوا اور دوسری قسم کے لوگوں سے خالی ہے مگر سید احمد خاں کے سفر پنجاب نے اس خیال کو بالکل مٹا دیا۔۔۔ سید احمد خاں صاحب ایک ضعیف آدمی، پنشن پانے والے، گوشہ نشین ہیں۔ نہ وہ امیر ہیں نہ کسی ملک کے حاکم، نہ صاحب مال ودولت، ان سے بہت زیادہ پرہیز گار۔ ہاں ایک جوش قومی ہمدردی کا، جو سید احمد صاحب کے دل میں ہے وہ کسی میں نہیں۔" (۱)

۱۸۵۷ء کے بعد کا ہندوستان ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں نہ واپسی کا کوئی راستہ تھا اور نہ آگے بڑھنے کا حوصلہ ایسے میں تحریک سر سید ایک ایسی مشعل راہ بن گئی جس کی روشنی میں باشعور مسلمانان ہند نے تابناکی حاصل

کی۔ان کی سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی اور زمانہ شناس نظروں نے اہل ہند کو علم و ہنر کی آگہی، تہذیبی شعور اور جدید انداز فکر دیا۔ زمانوں کے بدلتے تقاضوں کے مطابق انہوں نے قومیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔

مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

"ان کی تحریک نے ہم عصر معاشرے کو کئی حیثیتوں سے متاثر کیا۔اس تحریک نے ذہنی تربیت تمدنی مظاہر کی تشکیل و تعمیر اور مادی حالات کو ساز گار بنانے میں اہم حصہ لیا۔"(۲)

سر سید احمد خان کی تحریروں اور مساعی کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں کے حسن معاشرت، تہذیب، رسم ورواج، مذہب اور روایت و عقائد سے متعلقہ غلط اوہام اور ابہام کو دور کرنا تھا جو ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں کے دلوں میں ڈال دیا گیا۔

ڈاکٹر امت الحمید ہندوستان کے معاشرے پر چھائے ہوئے غیر ملکی تسلط کے اندھیروں کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کے اثر سے ہندوستان میں نہ صرف سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ زندگی کے تمام شعبہ فکر کو زندگی کے ہر شعبہ میں عروج و کامرانی حاصل کرنے کا سنہری موقع ملا لیکن مسلمان برطانوی حکومت کے پنجہ ظلم و استبداد کا شکار ہو کر تباہی و بربادی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ان کی اسلامی تہذیب اور ان کے علوم و اثرات حکومت کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے انھوں مسلمانوں کو کمزور اور بے بس کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔" (۳)

سر سید احمد خان کو اندیشہ تھا کہ اگر انگریز حکمرانوں کے ذہن سے مسلمانوں سے وابستہ ابہام اور رنجشوں کو دور نہ کیا گیا تو اس کے نتائج مسلمانان ہند کے لیے ٹھیک نہ ہوں گے اور ان کا یہ اندیشہ سو فی صد درست تھا کیونکہ اس وقت مسلمان نہ صرف انگریز حکمران کی ناراضگی اور ہندوؤں کی عیاری کا شکار تھے بلکہ وہ اپنی گم گشتہ اسلاف اور شاندار ماضی سے بھی برسرپیکار تھے۔ انھیں ذہنی، معاشی اور معاشرتی دباؤ کا سامنا تھا۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ مذہبی علماء اپنے اپنے نظریات کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ مسلمان اکابرین اپنی کھوئی ہوئی میراث پر نوحہ خواں تھے اور مسلم نوجوان اپنی ناقدری اور نا انصافی پر شاکی و نالاں تھے۔ ایسے میں سر سید ایک

معلم،ناقد،راہنما اور نجات دہندہ کے روپ میں ابھرے۔ان کا مقصد یہ تھا کہ جدید تعلیم کے ذریعے مسلمان ازمنہ وسطی کے ذہن سے نکل کر روشن خیالی کے دور میں داخل ہوں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس عقلیت کو جو روشن خیالی کے دور نے مغرب کو عطا کی تھی اپنا رہبر بنایا،علم کی جستجو کی اور عقل اور علم دونوں کو فطرت یا نیچر میں سمو دیا۔"(۴)

سر سید احمد خان نہایت زیرک،دوراندیش اور وقت کے تقاضوں کو فوراً سمجھ جانے والی بصیرت رکھتے تھے۔ مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ہی ان ذہن رسا نے انہیں آنے والے وقت سے آگاہ کر دیا۔اس ذہنی ارتقاء کے سفر میں انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس سوچ میں ان کی قوم بھی ان کے ساتھ شامل ہو ورنہ یورپی استعماری قوتیں ہند کے مسلمانوں کے نسل پرستانہ استحصال اور غارت گری کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز کر دیں گی جس کے اثرات آنے والی صدیوں میں بھی زائل نہ ہونگے۔ایسے میں سر سید کے ترقی پسندانہ شعور اور مسلمانان ہند سے گہری وابستگی نے ان سے ایک معلم،رہنما اور نجات دہندہ کا کردار ادا کروایا۔یہ فکر ایک طرح سے سر سید کی قائدانہ صلاحیتوں کا ادراک تھی جس نے ۱۸۵۷ء کے بعد ان سے اسباب بغاوت ہند جیسی تصنیف تخلیق کروائی۔تہذیب الاخلاق،سوسائٹی میگزین،اخبار سائینٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سر سید کے وہ کارنامے ہیں جن سے مسلمانوں میں نئے تقاضوں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ چلنے کی ضرورت کا ادراک ہوا۔

ڈاکٹر محمد خان اشرف سر سید کی فکر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سر سید احمد خان انیسویں صدی کے ہندوستان کے ایک عظیم عقلیت پسند انسان اور مفکر تھے ان کا یہ تصور ان کے علمی اور فلسفیانہ افکار کی بنیاد تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ سائنس اور مغربی تعلیم پر اس قدر زور دے رہے تھے۔ان کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا باعث یہ تھا کہ مسلمان اپنے علوم اور اپنے تمدن میں "عقلیت پسندی" سے منہ موڑ کر توہم،روایت پرستی اور رسومات میں گم تھے" (۵)

سر سید احمد خان نے سامراجی چالوں کا جواب بہترین حکمت عملی سے دیا۔اپنے تدبر،حکمت عملی اور سیاسی بصیرت سے انھوں نے ہند کے مسلمانوں کو جدیدیت کی راہ پر ڈالا۔۱۸۵۷ء کے بعد علمی و ادبی سطح پر سر سید

احمد خان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔انہوں نے اپنی ذات کو مسلمانان ہند کی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ سر سید احمد خان کے نمایاں کارناموں میں رسالہ اسباب بغاوت ہند،انگریزی سکول کی بنیاد،غازی پور سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ کالج کا قیام اور ۱۸۵۷ء کے حوالے سے انگریز اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی رنجشوں کو دور کرنا ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سر سید نے مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھا تو انھوں نے ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے مجلس تشکیل دی اور ہندوؤں کی سازش کو سمجھتے ہوئے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت سے بھی روکا۔وہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف ذاتوں، فرقوں،اور مذاہب کے لوگوں کو ایک قوم تصور نہیں کرتے تھے بلکہ وہ مسلمانان ہند کے الگ تشخص اور شناخت کے حامی تھے۔اس حوالے سے انہوں نے سیاست میں بھی عملی حصہ لیا اور ۱۸٦۸ء میں علی گڑھ میں برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔

مسلمانوں کو جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی اور سیاسی بصیرت پیدا کرنے کے لیے محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل سکول بھی اسی سلسلے کی بنیادی کڑی ہے۔ سر سید تعلیم، مذہب، سیاست اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے واضح نقطہ نظر رکھتے تھے جس کی بھرپور مخالفت بھی کی گئی مگر وقت نے ثابت کیا کہ سر سید کا عصری شعور دیگر مسلم لیڈروں کے برعکس زیادہ واضح تھا۔ سر سید احمد خان نے قوم کے دل میں جداگانہ حیثیت کا وہ احساس پیدا کیا اس نے مسلمانوں کو قعر گمنامی اور پستی سے نکالنے میں نہ صرف معاونت کی بلکہ ان میں نیا تعلیمی شعور بھی بیدار کیا۔

عقیلہ جاوید سر سید احمد کی تعلیمی مساعی کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "انھوں نے مشرق و مغرب کے افکار کے حسین امتزاج سے ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا۔ دنیاوی معاملات کا احساس دلایا۔ عقل، تجربے اور مشاہدے کے اصولوں کو اپنا کر زبان و ادب کے نئے سانچوں کے ذریعے نئے خیالات کو پیش کیا۔ مقاصد جمیلہ کی گرمی شوق و جوش نے اردو کو گوشہ گم نامی سے نکال کر پستی سے بلندی تک پہنچایا اور خاص و عام میں مقبول بنایا۔ انھوں نے ماضی کی صالح روایات اور جدید تہذیب سے استفادہ کر کے اپنے وقت کی اچھی تعمیر کی اردو ادب کو درباروں اور خانقاہوں کی محدود فضاء سے نکال کر تمام حلقوں اور شعبوں میں عام کیا۔" (٦)

سر سید احمد خان سے اردو نثر کی ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ جدید نثر کو حقیقت نگاری کا انداز سر سید کے مضامین نے ہی بخشا۔ موجودہ دور میں نثر میں جتنا بھی حقیقت نگاری کا رجحان نظر آتا ہے وہ بہت کچھ نثر سر سید کی عطا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو نظم و نثر کا کارواں قدیم راہوں پر رواں تھا۔ سر سید کی نثر جدید نثر کا وہ سنگ میل تھی جس نے عصر حاضر تک جدید نثر کو خاص رنگ عطا کیا۔ سر سید کو جدید اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے اور یہ درست ہے۔ انھوں نے نثر کی خوبصورتی سے زیادہ مطلب نویسی پر توجہ دی۔ غالب کی طرح وہ بھی طرز کہن سے ہٹ کر جدت، انفرادیت اور جدیدیت کی راہ اپنانے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے فکر وادب میں روایت کی تقلید سے انحراف کرتے ہوئے آزادی موضوع اور آزادی اسلوب کو اہمیت دی۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو سر سید نے اپنے مضامین کی جامعیت اور اسلوب سے نثر کو مصنوعی پن یعنی تصنع اور طوالت سے نکال کر سادگی، اختصار اور جامعیت کی راہ پر گامزن کیا انھوں نے ادب کو مقصدیت عطا کی۔ رنگین بیانی کی بجائے براہ راست مطلب نویسی کا انداز اپنایا۔ آرائش زبان اور لفظی بازیگری کی جگہ پر وقار، مؤثر اور جامع انداز تحریر کو فروغ دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ عہد سر سید میں پر تکلف، مقفیٰ اور مسجع اسلوب کی مثالیں نہیں تھیں یا ان کا رواج نہیں تھا بلکہ حقیقت میں ایسی ہی پر تکلف تحریروں کا رواج تھا انہیں کے درمیان رہتے ہوئے سر سید نے سادہ و سلیس اور عام فہم زبان کو فروغ دیا۔

امت الحمید کو ثر عہد سر سید کے لوگوں کے ذہنی و فکری رویوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "سر سید جن حالات اور ماحول میں پروان چڑھے اور جس زمانہ اور جس مقام میں نشو ونما پائی وہاں علمی فضاء کا دور دورہ تھا۔ دلی بڑے بڑے باکمالوں کا گڑھ تھی۔ سر سید کو مفتی صدرالدین آزردہ، مرزا غالب، اور مولانا امام بخش صہبائی جیسے اہل علم و ادب بزرگوں اور اساتذہ فن کی صحبت نصیب ہوئی۔ ابتداء ہی سے ان کو تالیف و تصنیف کے کاموں سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا جس قدر دل تصنیف و تالیف میں لگتا ہے کسی اور کام میں نہیں لگتا۔ انہیں شروع ہی سے اردو زبان سے ایک خاص قسم کا لگاؤ اور قلبی تعلق تھا۔ ان کا لسانی شعور بھی دہلی کی فضا کا پروردہ تھا۔" (۷)

سر سید کے عہد میں جہاں مسلمانان ہند نے بہت کچھ کھویا وہیں ان میں نئے تقاضوں کو سمجھتے اور ان کے ساتھ چلنے کی ضرورت کا ادراک بھی پایا۔ اور اس ذہنی ارتقاء میں سر سید کے عصری شعور کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ایک پژمردہ اور مایوس قوم میں امید اور اعتماد کی روح پھونکی۔ ان کی تعلیمی اور سیاسی بصیرت اور شعور نے مسلمانوں کو

وقت سے مقابلہ کرنے کی قوت بخشی۔ سر سید کی تحریک اور تحریر دونوں کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنا ،انہیں بے عملی اور مایوسی سے نجات دلانا اور بحیثیت قوم اپنا مقام اور ترقی حاصل کرنا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو اظہار مطالب کا ذریعہ بناتے ہوئے ایک مقصد دیا۔ مذہب، معاشرت، ادب، سیاست اور زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی اور ان کی ضرورت، مقصد اور افادیت کو واضح کیا۔

سر سید احمد خان وہ معلم، پیغامبر اور راہنما تھے جنہوں نے سیاسی اور ادبی دونوں سطح پر اپنے کردار کو بخوبی نبھایا اور لوگوں کی مخالفت اور ناپسندیدگی کے باوجود اپنی جدوجہد کو ایک فرض سمجھ کر ادا کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانان ہند کے ذہنی الجھاؤ اور مسائل کو عقلیت پسندی کی روشنی میں دیکھا اور عقل کے حق میں فیصلہ دیا وہ دل سے زیادہ عقل پر یقین رکھتے تھے۔ سنبل نگار سر سید کے کارناموں کے متعلق رقمطراز ہیں:

> "مذہب، معاشرت، ادب، سیاست۔۔۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو سر سید کی توجہ سے محروم رہا ہو لیکن وہ شے جسے سر سید کی نظر التفات نے مٹی سے سونا بنا دیا وہ اردو ادب اور خاص طور پر اردو نثر ہے۔۔۔ سر سید کا اصل مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنا، بے عملی سے نجات دلانا اور ترقی کے لیے کوشش کرنا تھا۔ چنانچہ ان کے پاس کہنے لیے بہت کچھ تھا۔" (٨)

خالص ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو اختصار، جامعیت اور سادگی کے باوجود سر سید کی نثر بڑے سے بڑے علمی سرمائے کا مقابلہ کرتی ہے۔ سر سید احمد خان نے پہلی بار سنجیدہ علمی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور ادبی موضوعات پر مضمون نویسی کا آغاز کیا انھوں نے سادگی اور سلاست کو اپناتے ہوئے اس میں ایسا طرز تحریر متعارف کروایا کہ بہت سے لکھنے والوں نے اس کو اپنایا۔ ان کی تحریروں نے مسلمانان ہند کے لئے دو بڑی خدمات سر انجام دیں۔ ایک سیاسی شعور بیدار کیا دوسرے ادب کو مقصدیت عطا کی۔ ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کی ضرورت کی آگہی دی۔

تحریک سر سید ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسا جرات مندانہ قدم تھا جس نے ان کے لئے سوچ اور فکر کے نئے در وا کیے۔ وہ جہالت کو انسان کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے سفر انگلستان، انگریزوں سے میل جول اور وسیع مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ صرف تعلیم ہی عوام کے مزاج و کردار اور سوچ میں تبدیلی لا سکتی ہے۔ جدید تعلیم وہ روشنی ہے جس سے پس ماندہ ذہنوں کو جلا مل سکتی ہے اور بر صغیر کی عوام

ترقی کی جانب گامزن ہو سکتی ہے۔وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان جدید تعلیم حاصل کر کے دنیا کے ترقی پذیر دھارے میں شامل ہوں صرف تعلیم ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے مسلمان دشمن ذہنوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔وہ ضروری سمجھتے تھے کہ نئے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلا جائے۔ڈاکٹر طیبہ خاتون سر سید کی فکر کے لوگوں پر اثرات کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"انہوں نے اپنے تعلیمی، سماجی ،مذہبی، تہذیبی اور اصلاحی متن سے اس دور کے تمام با شعور افراد کو دعوت فکر دے کر ان میں جوش و حوصلہ پیدا کیا اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ان کی تحریک نے خیالات و افکار کے تصادم کا عمل تیز تر کر دیا۔اور سیاست، معاشرت، تہذیب و ادب غرض کہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اس عہد میں مختلف نقطہ نظر سے لکھا جانے لگا۔" (٩)

سر سید صاحب بجنور سے مراد آباد آئے تو ان کے اندر ایک شدید خواہش بیدار ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو سن ستاون کے ہنگاموں میں قائدانہ شرکت کے الزامات سے بچائیں۔اس سوچ کے زیر اثر انہوں نے نئی سیاسی حکمت عملی کو اپنایا اور مسلمانوں کے دینی نقطہ نظر میں تبدیلی کی کوشش کی۔اس خاص نقطہ نظر کے تحت انہوں نے جدید علم کلام کی بنیاد رکھی۔انہون نے یہ ضروری سمجھا کہ حکمرانوں اور مسلمانوں کے مابین دینی بنیادوں پر سمجھوتہ اور سیاسی رابطہ بحال کیا جائے اس ضمن میں انہوں نے جو تصانیف لکھیں وہ ان کے خیالات کو واضح کرتی ہیں۔

ان تصانیف میں

☆　تاریخ سرکشی بجنور　　☆　رسالہ اسباب بغاوت ہند

☆　رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا　　☆　تبئین الکلام شامل ہیں

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں

"اس دور میں سر سید کا نقطہ نظر علمی اور خالصتاً دینی تھا۔زندگی کی مادی قدروں کی پوری اہمیت ابھی ان پر منکشف نہیں ہوئی تھی وہ مسائل حاضرہ کی بجائے تاریخ کی طرف توجہ اور مجرد حقائق اور محض علمی تصورات کے دلدادہ تھے۔چنانچہ اس زمانے میں مناظرہ اور عقائد ان کی جستجو کے خاص میدان تھے اگر کبھی اس کوچے سے باہر قدم رکھا بھی تو انہوں نے پتھروں اور اینٹوں کو مرکز توجہ بنایا۔یعنی آثار قدیمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔گویا ابھی وہ اجتماع انسانی کے مادی مسائل سے بہت دور تھے۔"(١٠)

ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی واجتماعی زندگی کو کمپنی کی حکومت اور ہندوؤں کی سازشوں نے جس بے رحمی سے زوال کے قریب لا کھڑا کیا تھا اس کے اثرات ہر خاص وعام کے چہروں سے مترشح تھے۔ تاریکی، مایوسی اور ناامیدی کے اس دور میں سرسید احمد خان امید کی کرن لے کر میدان میں اترے۔ انھوں نے نہ صرف اخلاقی، سیاسی، اور سماجی حوالے سے بلکہ علمی و ادبی حوالے سے بھی ہند کے مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں کو عصری شعور اور آگہی دی۔ اس حوالے سے علی گڑھ تحریک کا کردار کسی تعاون کا محتاج نہیں۔

سرسید احمد خان کے دل میں شروع ہی سے مسلم امہ کی بھلائی کا خیال تھا اور فلاح عامہ کے امور میں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ان کے خلوص اور نیک نیتی نے ان سے غیر معمولی کام کروائے۔ سرسید نے جس دور میں علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی وہ اس دور کی اہم ضرورت تھی۔ ہند کے مسلمان اور نوجوان یقین اور غیر یقینی کی فضا میں جھول رہے تھے۔ سرسید کی تحریک نے انہیں ایک مقصد دیا اور زندگی کو بہتر ڈگر پر لے جانے کے اصول واضح کئے۔ مغل سلطنت کا شیرازہ تو بکھرا ہی تھا بغاوت ہند کے اثرات نے مسلمانوں کے حال اور مستقبل دونوں کو ہی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایسے میں سرسید نے اہل ہند کو جدید تعلیم کے حصول کے لیے آمادہ کیا۔ سرسید احمد خان ویسے تو شروع سے ہی اہل ہند کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے مگر سن ستاون نے ان کے ذہن کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ ان کے ذہن رسا نے اس کے اثرات اور نتائج کو جس طرح پرکھا اور اس سے نپٹنے کے لیے جو لائحہ عمل اختیار کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ان کے ادراک اور آگہی نے سب سے پہلے جدید تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ علی گڑھ تحریک کے ساتھ سکول، کالج، انجمنیں اور رسائل واخبارات کا اجراء بھی کیا۔

مسلمان نوجوانوں کو جدید تعلیم کی ضرورت اور افادیت کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا۔ انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب، معاشرت، ادب اور سیاست پر بھی خصوصی توجہ دی اور یہ تمام کاوش مسلمانوں اور نوجوانوں کے لیے تھیں۔ ان کے دل میں ہند کے مسلمانوں کے لیے جو درد اور جذبات تھے وہ انہیں بے چین رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بے شمار اصلاحی واخلاقی مضامین لکھتے تھے جن میں شستہ، سلیس اور آسان اسلوب میں ہند کے مسلمانوں کو درپیش مسائل کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان کا حل بھی پیش کیا۔ علی گڑھ تحریک کے ہر عمل پر سرسید کی شخصیت کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے قدامت سے جدیدیت کے سفر کا آغاز کیا اور مسلمانوں کے ذہنوں کو وقت کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کا سبق دیا۔ سرسید احمد خاں نے مسلمان نوجوانوں کو قومی مسائل کا حل کرنے کے لیے جدید تعلیم کے حصول اور عملی طور پر کچھ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس سفر

میں بہت سے اکابرین اور مدبرین میں ان کے ساتھ شامل ہوئے جس نے سر سید کی مساعی کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ سر سید نے ہند کے مسلمانوں کے زوال اور اسلام کی خستہ حالی کی وجوہات جاننے کی بھی کوشش کی۔ "تہذیب الاخلاق" میں قومی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی موضوعات پر مضامین لکھے۔ ان کی یہ کاوشیں محدود نہیں تھیں۔ بلکہ ان کا دائرہ کار پورے ہندوستان پر محیط تھا۔ انہوں نے قدیم روایات سے ہٹ کر جدید طرز حیات اور انداز فکر کی ضرورت پر زور دیا۔

ان کی طرز فکر اور عملی کوششوں نے زندگی کے ہر شعبے پر اثر ڈالا۔ سر سید کے تنقیدی اور تحقیقی شعور سے آج بھی محققین اور ادب کے قارئین استفادہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں سے دلی محبت کے جذبے نے انہیں قومی کاموں کی تحریک دی۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی بھلائی اور بہتر مستقبل کے لیے فکر مند رہے۔ اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کر کے خود کو اس کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔ یہ تبدیلیاں معاشی ہوں، معاشرتی ہوں، سماجی ہوں، تعلیمی ہوں، سیاسی ہوں یا ادبی ان سب میں عصری شعور کا ارتقاء نہایت ضروری ہے۔ سر سید احمد خان کو ان کا گہرا ادراک تھا جس کے زیر اثر انھوں نے مسلمانان ہند کے لیے قلمی اور عملی ہر طرح کی خدمت سر انجام دی۔

## حوالہ جات


۱۔ اقبال علی، مولوی سید "سید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب" (مرتبہ) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص: ۱، ۲

۲۔ مسکین علی حجازی "صحافت کی مختصر ترین تاریخ"، ص: ۸۹

۳۔ امت الحمید کوثر، ڈاکٹر "زبان و ادب" مشمولہ "اردو نثر کے اسالیب" (مرتبہ) ڈاکٹر عقیلہ جاوید، ص: ۴۷

۴۔ آل احمد سرور "مجموعہ تنقیدات"، ص: ۹۵۱

۵۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر "تنقیدی و تحقیقی مطالعہ"، ص: ۱۵۷

۶۔ امت الحمید کوثر، ڈاکٹر "زبان و ادب" مشمولہ "اردو نثر کے اسالیب" (مرتبہ) ڈاکٹر عقیلہ جاوید ص: ۶۵

۷۔ ایضاً، ص: ۴۶

۸۔ سنبل نگار "اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ" مشمولہ "آزادی کے بعد دہلی میں اردو" (مرتبہ) ڈاکٹر نصیر احمد خان، ص: ۳۰۵، ۳۰۶

۹۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر "اردو میں ادبی نثر کی تاریخ"، ص: ۸۷

۱۰۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ "سر سید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر"، ص: ۸

ڈاکٹر ارم صبا
پنجاب کالج برائے خواتین راولپنڈی
ڈاکٹر شگفتہ فردوس
استاد شعبہ اُردو ، جی سی ویمن یونیورسٹی ،سیالکوٹ

# جدید اردو نظم میں اساطیری حوالے

## Mythology in Modern Urdu Poem

Word "myth" is derived from the Greek word mythos, which simply means story. A myth is a story, a traditional story consisting of events that are ostensibly historical, though often supernatural, explaining the origins of a cultural practice or natural phenomenon. These stories are especially linked to the religious beliefs and rituals. Urdu literature is deeply influenced by myth, especially Hindu and Greek myth .Myths is the basic element of human culture and exists in every society. Besides literature, myths play a great role in science, psychology and philosophy. Urdu literatures have treasure of asateer. Classical Urdu nazm /masnavi based on supernatural characters. A myth can be a story involving symbols that are capable of multiple meaning, so modern Urdu poets use myth as symbols also.

**Keywords:** *Myth, Greek, Traditional Story, Supernatural, Religious beliefs, Rituals.*

ماضی کے انسان کی توہم پرستی نے ہر شے کو پر اسرار بنادیااور ہر عمل کسی نہ کسی دیوتا سے منسوب کر دیا گیا۔ان دیوتاؤں کو خوش رکھنا بہت ضروری ہو گیااس مقصد کے لیے عبادات، قربانی، تحائف اور خوشامد کی رسومات کی ابتدا ہوئی۔ بھوت پریت، جادوٹونے، اور موکلات جیسے عوامل فروغ پانے لگے۔ایک قبیلے کے افراد نے دوسرے قبیلے کے لوگوں کو مصائب سے نجات کے لیے دیوتاؤں کی خوشنودی کے طریقے بتائے یوں کہانی کا سلسلہ چل نکلا جو بعد ازاں اساطیری صورتوں میں ڈھل گیا۔

اسطورہ، اساطیر اور دیومالا کے لیے انگریزی زبان کا لفظMythاستعمال ہوتا ہے۔کسی ایک تہذیبی منطقے کی اساطیر یا مختلف تہذیبوں سے متعلق اساطیر کے مجموعہ کوMythologyکہا جاتا ہے۔[1] اساطیر کی جڑیں ما قبل تاریخ میں نہ جانے کب سے پیوست ہیں۔اساطیر کا ارتقاء دنیا کے مختلف علاقوں کے مختلف قبیلوں میں مختلف انداز

سے ہوا اور یوں ایک عجیب و غریب پر اسرار دنیا وجود میں آئی۔ جنگلوں میں شکار کی زندگی نے جانوروں کے چہروں اور پیکروں کو اہمیت دی۔ قدرت اور موسم کے خوف نے دیوی دیوتاؤں کو متعارف کروایا اور ان دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جانے لگی۔ مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کے اپنے اپنے الگ دیوتا ہوتے تھے ہر ایک کی خصوصیات مختلف تھیں۔ اساطیر کہانیوں میں مسرت انگیز لمحات ہوتے ہیں اور یہ معجزات کی دنیا ہے۔

اساطیر نے ادب کو متاثر کیا اور ادب کو ہمیشہ سے ایک نیا موضوع دیا اساطیر کا تنوع ادب میں انگارنگی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔[٢] اساطیر نے ادب کو متاثر کیا تو فنکاروں نے اپنی تخلیقات میں اساطیر کو جگہ دی۔ ہومر نے ایلیڈ اور اوڈیسی میں اساطیر کی دنیا خلق کی۔ یورپ میں ہومر کی دونوں "ایپک" کو بائبل کی طرح عزیز رکھا جاتا ہے۔ شکسپیئر، کیٹس، شیلے، صوفوکلیس، یوری پیڈس وغیرہ کی تخلیقات میں اساطیر کی دنیا آباد ہے۔

اردو ادب میں اساطیری حوالوں نے ادب کو نئی راہوں سے روشناس کرایا۔ ادبی فن پاروں میں اساطیری سلسلوں کو کثرت کے ساتھ کہیں اشارات اور کہیں وضاحتوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جدید اردو نظم کا شاعر تخلیقِ فن کے مرحلے پر اپنے خارج کی دنیا اور اپنے داخل کی کائنات میں ایک ربطِ باہم قائم کرتا ہے تو ان کی تجسیم اس انداز میں کرتا ہے کہ نہ صرف اشیاء زندہ محسوس ہوتی ہیں بلکہ شاعر کے اندر کی دنیا بھی نظر آنے لگتی ہے۔ جدید اردو نظم کائنات کی من و عن پیش کش کا نام نہیں بلکہ شاعر خارج کو اپنے اندر جذب کرتا ہے پھر ان کے اساطیری، علامتی روپ کو نظم کی بنت میں شامل کرتا ہے۔ عقیل احمد صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جدید شاعروں نے اسطور کے استعمال میں عموماً آفاقی نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور خود کو اپنی تہذیب سے وابستہ اساطیر تک محدود نہیں رکھا بلکہ بعض یونیورسل اسطوروں کا بھی سہارا لیا ہے"[٣]

یونانی اور ہندی اساطیر کی خصوصاً اردو ادب پر گہری چھاپ ہے۔ یونانی اساطیر کے کچھ دیوتا تو ایسی شہرت اختیار کر گئے کہ آج بھی ان کے نام علامات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اپالو (زیوس اور لیٹو کا بیٹا) جو قوت اور خوب صورت جسم کے لِے شہرت رکھتا تھا۔ "ہرکولیس" جو طاقت کا علم بردار تھا۔ "نارسیس" حسن و جمال میں یکتا تھا۔ پرومیتھس "حق و مظلومیت کی علامت تھا۔ پنڈورا باکس کی اساطیری اصطلاح بھی اردو ادب میں کثرت سے

استعمال کی جاتی ہے۔اردو ادب پر ہندی اور یونانی اساطیر کے اثرات اور ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ داستان، افسانے، ناول، شاعری غرض تمام اصناف پر اساطیر کی گہری چھاپ ہے۔

اردو شاعری میں ابتدا ہی سے اساطیری حوالوں کی بھرمار رہی ہے۔ قدیم مثنویوں کے کردار، ماحول اور کہانیاں پر اسرار اور غیر معمولی ہیں۔ ان مثنویوں کے ہیرو کسی بھی دیوتا سے کم نہیں ہیں۔ قدیم اردو مثنویوں میں جنوں اور پریوں کے قصے، جادوگر، ساحر اور نجومی ہیں جو بادشاہوں کو آنے والے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ جدید نظم میں بھی اساطیری حوالوں کو اپنایا گیا۔ اردو نظم کے تقریباً تمام شعراء نے اساطیری علامات سے کام لیا ہے اور بلا واسطہ اظہار کی بجائے بالواسطہ اظہار کا طریقہ اپنایا ہے۔ اظہار کا یہ طریقہ نظم میں دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔

ہندوستان میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی روایت بہت پرانی ہے۔ دیوی دیوتاؤں کو شاعری میں بہت سے ناموں سے مخاطب کیا گیا ہے۔ میراجی کو یونانی اور ہندی اساطیر پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ہندی اساطیر نظم کی فضا کو پر اسرار بناتے ہیں۔ میراجی کی اکثر نظموں میں رادھا اور کرشن کی محبت کا ذکر ملتا ہے۔ نظم "سنجوگ" میں میراجی رادھا اور کرشن کی جدائی کا منظر بیان کرتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری /، مثنوی کا ہیرو دیوتاؤں کی صفات اور شان رکھتا تھا آج بھی جب کوئی عورت اپنے ہیرو کی بہادری کی مثال دینا چاہے تو کسی دیوتا کو علامت کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی نظم "میگھ دوت" میں ایسے ہی دیوتا کا تذکرہ کیا ہے۔ ہندو دیومالا میں یہ دیوتا "اندرا، بجری ، میگھا، سور گاپتی اور سکرا" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دیوتا کی بہت سی صفات بیان کی جاتی ہیں یہ جھلسی ہوئی کھیتی کو پامال کرتا ہے اور پیاسی زمین کو سیراب کرتا ہے:

سنسناہٹوں کے ساتھ
گڑگڑاہٹوں کے ساتھ
آگیا/ پورن رتھ پر بیٹھ کر
میرا میگھ دیوتا
دوش پر ہواوں کے بال اڑاتا ہوا
اس کا جامنی بدن آسماں پہ چھا گیا
بڑی گھن گرج کے ساتھ

ٹوٹ کر برس پڑا
اور میں آنکھیں موند کر
ہاتھ پسارے ہوئے دوڑتی چلی گئی
انگ سے لگا رہی / نیل اس کے انگ کا
مگر ملن کی پیاس پھر بھی باقی ہے(۴)

شاعرہ نے بدھ اساطیر سے تخلیق سطح پر جو رشتہ قائم کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سرمد صہبائی اپنی نظم میں شیو دیوتا کو او مہاویر کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ آ کر خلقت کا دکھ دور کریں۔ "جاتک کہانی" میں سرمد صہبائی نے گوتم کی پیدائش سے موت تک کی کہانی بیان کی ہے۔ تبسم کاشمیری کی نظم "سد ھارتھ" میں گوتم بدھ کے سفر کی داستان بیان کی گئی ہے۔

راشد کی نظم میں بے شمار اساطیری علامات ملتی ہیں۔ ان کی نظموں کو پڑھیں تو ایک عجیب سی اساطیری فضا خلق ہوتی ہے۔ سمرقند، بخارا، صحرا اور سبا، بغداد، شہر کی فصیل، کاخ و کو، جنگل، عہدِ تاتار کے خرابے، اقلیم شیر و شر، یاجوج ماجوج، اسرافیل، مدائن، کاہن، ابولہب، آدم زاد، جسم کی راکھ، راہبہ سراب، نمرود، ہیکل تراش وغیرہ جیسی علامتیں نظم کو مکمل اساطیری بناتی ہیں۔ راشد کی نظمیں خصوصًا "حسن کوزہ گر، اس پیڑ پر ہے بوم کا سایہ، اسرافیل کی موت، ابولہب کی شادی، بوئے آدم زاد خوب صورت اساطیری حوالوں سے مزین ہیں۔

ہندو دیومت اور یونانی دیومالا میں بہت سے ایسے دیوتا دکھائی دیتے ہیں جنہیں ان کے کردار اور تعلیمات کی بدولت لافانی بنا دیا گیا۔ وزیر آغا کی نظم کا کردار پرومیتھس یونانی دیومالا کا ایک ایسا ہی کردار ہے۔ "ایک کتھا انوکھی" وزیر آغا کی نظم ہے۔ نظم میں اساطیری حوالے اور کردار ہیں۔ نظم کا آغاز ہی پر اسرار فضا سے ہوتا ہے۔ کائنات تباہی کی طرف گامزن ہے۔ وشنو سویا ہوا ہے وہ جاگنے پر اور جاگ کر کائنات کو درست کرنے پر تیار نہیں ہے۔ وشنو ہندوستانی اساطیر کا ہم استعارہ ہے۔ چرند، پرند،، بادل ہوا سب اس کو جگانے کی کوشش میں ہیں۔ بالآخر سونے والا جاگتا ہے اور اٹھ کر حیرت سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے جواب میں شاعر اپنے درد کا نوحہ سناتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ دھرتی بنجر ہو چکی ہے۔ شاعر وشنو کو بتاتا ہے کہ پنڈورا کا قفل کھلا تھا اور بلائیں نازل ہوئیں تھیں:

ایک پہاڑ پھٹا تھا
پنڈورا کا قفل کھلا تھا
اور بلائیں
چیخوں کی صورت نکلیں تھیں(۵)

پنڈورا کا حوالہ اساطیری ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پنڈورا کو دیوتاؤں نے پرومیتھیس کے لیے بھیجا تھا مگر اس نے پنڈوارا کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایپے میتھس نے پینڈورا کو اپنا دوست بنالیا اور اس کے صندوق کا قفل کھولا جسے وہ مصائب سے بھر کر لائی تھی۔ نظم میں آگے چل کر وزیر آغا بتاتے ہیں کہ وہی پینڈورا اب کہ کرخت آوازوں کا تحفہ لائی ہے اور یہ آوازیں کائنات کا حسن کھا گئی ہیں اور کائنات کی خوب صورتی کا ختم کر رہی ہیں۔ کہانی کچھ اور آگے بڑھتی ہے اور شاعر بتاتا ہے کہ "نامی" نام کی سہاگن کے ساتھ معاشرے نے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس کا بیٹا جھیل سے واپس نہیں آیا تو اس نے کالی کا روپ دھار لیا:

-------ایک ہی شب میں
کالی بن کر بھڑک اٹھی تھی
اور گلیوں میں جو بھی بچہ ملتا
وہ خونی پنجوں سے اس کی
بوٹی بوٹی کر دیتی تھی(۶)

نظم کی مجموعی فضا ہندی اساطیر کو ظاہر کرتی ہے۔ وزیر آغا ہی کی نظم "آدھی صدی کے بعد" کی فضا بھی اسطوری ہے۔ نظم چار حصوں پر مشتمل ہے اور یہ چار حصے انسانی زندگی کے چار ادوار کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ادوار ایک مسلسل سفر ہیں اور اس میں پیش آنے والے واقعات کو شاعر اساطیر کی مدد سے بیان کرتا ہے۔ نظم میں کلاسیکی مثنویوں کی طرح کہیں خوفناک بلائیں ہیں تو کہیں اژدھے۔ نظم کا مرکزی کردار کوہ قاف کی پری کی تلاش میں چلتا چلا جاتا ہے۔ اس سفر میں شاعر کو کہیں کہیں اپنے گرد حصار بھی محسوس ہوتا ہے یہ ایسا حصار ہے جسے کوئی درویش کسی سالک کی حفاظت کے لیے کھینچتا ہے۔ پرومیتھس اور پینڈورا کے اساطیری حوالے عبد العزیز خالد نے بھی اپنی نظم "حریرِ رگِ گل" میں استعمال کیے ہیں۔

اردو نظم میں اساطیری قصوں کے استعمال کا رواج بہت پرانا ہے۔ اردو ادب میں ایسے بہت سے کردار ہیں جنہیں مختلف عقیدوں اور مذہبی افکار نے اہم حیثیت دی۔ خوف تحیر اور رحمت کے یہ پیکر رفتہ رفتہ حسی پیکر بنتے گئے۔ عوامی احساسات و جذبات ان میں شامل ہونے لگے۔ رام اور سیتا کے اساطیری حوالے بھی اردو نظم میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ سیتا کی اگنی پریکشا کا واقعہ اردو نظم و نثر دونوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ راجا دسترتھ کے بیٹے رام کے بن باس میں ان کا بھائی لچھمن ان کے ساتھ تھا۔ ایک دن جب رام شکار کے لیے گئے تو راون سیتا کو اٹھا کر لے گیا۔ راون اور رام کی جنگ کے بعد رام سیتا کو واپس لے آتا ہے لیکن لوگ سیتا پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ پاک نہیں ہے۔ رام نے اپنی بیوی سیتا کو پاکیزگی کا یقین دلانے کے لیے اگنی پریکشا دینے کو کہا۔ سیتا اس آزمائش سے گزرتی ہے اور کامیاب ہوتی ہے لیکن اس کے اعتماد کی کرچیاں ہو جاتی ہیں اور وہ رام سے دور ہو جاتی ہے۔ زہرہ نگاہ نظم "بن باس" میں اسی واقعے کو بیان کرتی ہیں:

سیتا کو دیکھے سارا گاؤں
آگ پہ کیسے دھرے گی پاؤں
بچ جائے تو دیوی ماں ہے
جل جائے تو پاپن
جس کا روپ جگت کی ٹھنڈک
اگنی اس کا درپن
سب جو چاہیں سوچیں سمجھیں
لیکن وہ بھگوان
وہ تو کھوٹ کھپٹ کے بیری
وہ کیسے نادان
اگنی پار اتر کے سیاں
جیت گئی وشواس
دیکھا دونوں ہاتھ پھیلائے

رام کھڑے تھے پاس
اس دن سے سنگت میں آیا
سچ مچ کا بن باس (۷)

بھوت، آسیب اور روحیں اکثر نظموں میں علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ زہرہ نگاہ کی نظم "کوہِ ندا" میں پر اسرار آواز کا تذکرہ ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ خوف و اسرار کی پیش کش نظم کو اساطیری فضا فراہم کرتی ہے۔ قصوں کہانیوں میں جن اور چڑیلیں و عفریتیں بہت طاقت ور ہوتے ہیں۔ پروین شاکر کی نظم "یہ گئی اماوسوں کا ذکر ہے۔۔۔۔" میں شاعرہ کہانی سناتی ہیں۔ نظم کا مرکزی کردار ایک شام گھر لوٹتے ہوئے راستہ بھول گیا ہے اور جنگلوں میں بھٹک رہا ہے کہ اچانک:

نا کہاں کسی گھنیری شاخ کو ہٹا کے
روشنی کے دو الاؤ دہک اٹھے
ان کی آنچ میرے ناخنوں تک آ رہی تھی
ایک جست۔۔۔۔
اور قریب تھا، کہ ہانپتی ہوئی بلا
مرے رگِ گلو میں اپنے دانت گاڑ دیتی
دفعتًا کسی درخت کے
عقب میں چوڑیاں بجیں
کھلے ہوئے دراز گیسوؤں میں آنکھ مارتا ہوا گلاب
وہی بلا، وہی نجس، وہی بدن دریدہ فاحشہ
تڑپ کے آئی۔۔۔۔ اور۔۔۔
میرے اور بھیڑیے کے درمیان ڈٹ گئی (۸)

منیر نیازی کی نظم کا معتبر حوالہ خوف، دہشت، اور پر اسراریت ہے۔ جادوئی مناظر، مافوق الفطرت عناصر اور طلسماتی فضا منیر کی نظموں کا اہم حصہ ہیں۔ منیر کے ہاں چھل پیریاں، چڑیلیں اور آسیب ایک دہشت ناک صورِ حال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں کی پر اسرار فضا اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ "آتما کا روگ، ایک آسیبی رات، موسم بہار کی دوپہر، لیلی، اور ایک بھاری رات، جنگل میں زندگی، پاگل پن، ویران درگاہ میں آواز اور دھوپ میں ایک غیر آباد شہر کا نظارہ" جیسی نظمیں اساطیری فضا کی حامل ہیں۔ نظم "بھوتوں کی بستی" میں شاعر نے اساطیری فضا تخلیق کی ہے:

پیلے منہ اور وحشی آنکھیں، گلے میں زہری ناگ
لب پر سرخ لہو کے دھبے، سر پر جلتی آگ
دل ہے ان بھوتوں کا یا کوئی، بے آباد مکان
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا، اک لمبا قبرستان(٩)

منیر نیازی کی اکثر نظموں میں خوف اور دہشت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ "جنگل کا جادو" میں دہشت کی امیجری اتنی بھرپور ہے کہ پورا منظر ہی ہولناک اور خون آشام دکھائی دیتا ہے:

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی
اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے
ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے(١٠)

آسیب درختوں پر اپنا ٹھکانہ بناتے ہیں اور اماوس کی راتوں میں بھول چوک سے اپنے پاس آنے والوں پو قبضہ کر لیتے ہیں اور اس شخص کا جینا دو بھر کر دیتے ہیں۔ اردو داستانوی ادب میں تو یہ عناصر ہمیشہ سے کار فرما تھے ہی اردو نظم میں بھی ابتدا سے یہ عناصر کسی نہ کسی صورت میں سر گرم عمل رہے ہیں۔ اور جدید اردو شعراء نے بھی ان علامات اور اساطیری حوالوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

یاسمین حمید کی نظم "گھنے پیپل" میں بھی پیپل آسیب زدہ نظر آتا ہے۔ سرمد صہبائی کی نظم "قصہ بابے بوڑھ والے کی بیٹی کا" میں شاعر کہانی اساطیری حوالوں کی مدد سے بیان کرتا ہے۔ انجان آواز پر پلٹ کر دیکھنا اور پتھر کا ہو جانا اردو داستانوں میں ایسے واقعات کثرت سے ملتے ہیں۔ سجاد باقر رضوی اردو ادب میں اساطیر کے متعلق لکھتے ہیں:

> "یہ دیومالائیں، لوک گیت اور جنوں پریوں کی کہانیاں ہماری روحانی واردات کی ایک حد ہیں۔ ان کی دوسری حد ہمارے زمانے کا شعری اور نثری سرمایہ ہے"(۱۱)

فہمیدہ ریاض نے اپنی نظم "شہر والو سنو" میں اساطیری حوالوں کو جذبات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ ماضی کی حسیت نے اس دور کے انسان کا المیہ بیان کرنے کا فرض بخوبی نبھایا ہے:

دور دیسوں میں ہوتا ہے کیا
ماجرے آج سارے سنو
وہ سیاہ چشم، پستہ دہن، سیم تن، نازنیں عورتیں
وہ کشیدہ بدن، سبز خط، خوش قطع ماہرو نوجواں
اور وہ جادوگری ان کی تقدیر ہے
وہ طلسمات، سرکار کی نوکری
اک انوکھا محل
جس سے گزرو تو ہر شاہزادے کا سے خوک کا بن گیا(۱۲)

جیلانی کامران کی نظم "ابی نمر" کا کردار "ابی نمر" ایک فرضی کردار ہے۔ یہ کردار ابنِ عمر کے کردار سے متاثر ہے۔ ابنِ عمر کا کردار غرناطہ کی شکست کے بعد الحمرا کی بدحالی اور تباہی کے بعد منظوم کیے گئے قصوّں میں سے ایک ہے۔ لیکن نظم میں ابی نمر کا زمانہ شاعر نے غرناطہ کی شکست سے قبل کا دیا ہے۔ نظم کا پلاٹ عربوں کی فتوحات سے متعلق ہے اور اردو نظم کا رشتہ عربوں کی عظیم الشان علمی و ادبی روایتوں سے جوڑتا ہے۔ شاعر داستان گو کی طرح ابی نمر کا قصّہ سناتا ہے۔ جیلانی کامران کی نظموں میں مذہبی و اساطیری حوالے جابجا ملتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم کی نظم "سقوطِ بغداد" تہذیبوں کے زوال کا نوحہ ہے۔ شاعر اساطیری حوالے استعمال کرتا ہے:

نجف سے گزرا تو میں نے دیکھا
ستون و محراب پر جھپٹتے ہوا کے قزاق کتنی صدیوں کے
شوق سجدوں کو بردِ بارود کر چکے تھے
سحر مجھے کربلا میں آئی
گہاں کلسٹر بموں کے شب خون کی شفق سے
کشیدہ سر جرأتوں کا سورج نکل رہا تھا
ہر ایک گھر میں صدائے شہ مرد گونجتی تھی
وہاں سے آگے فرات و دجلہ کے پار پہنچا تو میں نے دیکھا(۱۳)

ساقی فاروقی اپنی نظموں میں سیاسی و سماجی صورتِ حال کو تاریخی حوالوں کی مدد سے پیش کرتے ہیں۔ نظم "بہرام کی واپسی" میں وہ کشائشِ زمانہ کو بہرام کے تاریخی کردار میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ سرمد صہبائی کی نظم "جاتک کہانی" کی فضا بجی اساطیری ہے۔ سرمد صہبائی نے گوتم کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام سفر کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ گوتم کی ماں سپنے میں دیکھتی ہے کہ اس کی کوکھ میں ست رنگ دریا چڑھتا ہے۔ اور اس اجلے پانی میں پورن ماشی کا سایا ہے۔ رفیق سندیلوی کے ہاں قدیم اساطیر، قصص و روایات، اور مذہبی حکایات کو زمانہ حال کے تناظر میں ڈھالتے ہوئے اس عصری شعور کی صورت گری کی گئی ہے جو مابعد جدید عہد کی حسیّت کو ایک علاحدہ سیاق میں پیش کرتا ہے۔ بقول دانیال طریر:

"رفیق سندیلوی کی بیش تر نظمیں لوک کہانی اور اساطیری فضا میں وقت ناوقت، خواب و حقیقیت، وجود و عدم، مکاں لا مکاں، من و تو، جبر و اختیار، نیز وحدت و کثرت کے معنی تلاش کرتے ہوئے نت نئی تمثالیں گھڑتی اور پیش کرتی چلی جاتی ہیں۔"(۱۴)

"سواری اونٹ کی ہے" نظم میں مرکزی کردار کئی سال بعد گلی میں پلٹ کے آتا ہے جہاں وہ ایک عورت کو اپنے وعدے کی ڈور سے باندھ کر گیا تھا۔ رفیق سندیلوی کی نظم "مگر مچھ نے مجھے نگلا ہوا" میں شاعر نے ڈرامائی طرزِ تخاطب سے کام لیا ہے۔ وہ عصری ماحول کی آلودگی پر فریاد کناں ہے۔ نظم میں وہ اپنی ماں سے مخاطب ہے۔ ستیہ پال آنند جدید اردو شاعری کا اہم نام ہے۔ ہندوستانی اور یونانی اساطیر سے انہوں نے گہرا رشتہ قائم رکھا ہے۔ "کالا جادو، پیڑ پر سوت کی، الوداع، ایڈیپس ایک سوچ میں گم ہے، آخری چٹان تک، دو بھائی، کھوئی ہوئی پری، نٹ راج، وغیرہ جیسی نظمیں ان کے اساطیری جبلت کو ظاہر کرتی ہیں۔ فضا اعظمی کینظم "داستانِ بے ضمیری" طنزیہ نظم ہے۔ داستان کا آغاز شاعر نے قابیل کے اساطیری کردار سے کیا ہے اور اس کا اختتام دورِ حاضر میں ہوتا ہے

اساطیر ہر دور کے شعراء کے لیے باعثِ کشش رہی ہیں۔ اساطیر ایک طرف خارجی مظاہر کو متشکل کرتی ہیں تو دوسری جانب داخلی واردات کی مظہر ہیں۔ اردو شعراء نے بلاواسطہ اظہار کی بجائے بالواسطہ اظہار کا طریقہ اپنایا جس میں علامتی اور تمثیلی طرز کے ساتھ ساتھ اساطیری طریق کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس طریقہ اظہار کو ادب میں اس لیے بھی پذیرائی ملی کہ اس میں معنویت کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ اردو نظم کے شعراء نے اساطیری حوالوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور عصری حسیت کے بیان کے لیے اساطیری حوالوں سے کام لیا۔

## حوالہ جات


۱۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۰۹، ص ۱۳

۲۔ ایضاً، ص ٦٦

۳۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم (نظریہ و عمل) علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء، ص ۴۰۸

۴۔ فہمیدہ ریاض، سب لعل و گہر، لاہور، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۹۸

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۱ء، ص ۳۷

۶۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،ایضًا،ص۵۲۷
۷۔ زہرہ نگاہ،شام کا پہلا تارا،نئی دہلی،مکتبہ جامعہ،۲۰۱۲ء،ص۲۷
۸۔ پروین شاکر،خوش بو،نئی دہلی،شانِ ہند پبلیکیشنز،۱۹۸۸ء،ص۱۵۱
۹۔ منیر نیازی،جنگل میں دھنک،لاہور،نیا ادارہ،بار اوّل،۱۹۶۰ء،ص۴۹
۱۰۔ منیر نیازی ،ایضًا،ص۶۵
۱۱۔ سجاد باقر رضوی ،ڈاکٹر،تہذیب و تخلیق،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۷ء، ص۱۹
۱۲۔ فہمیدہ ریاض ،،سب لعل و گہر،لاہور،سنگِ میل پبلیکیشنز،۲۰۱۱ء،ص۱۴۵
۱۳۔ آفتاب اقبال شمیم،میں نظم لکھتا ہوں ،پورب اکادمی اسلام آباد ،۲۰۰۹ء،ص۱۱
۱۴۔ دانیال طریر،معاصر تھیوری اور تعینِ قدر ، مہر در انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز،کوئٹہ، ۲۰۱۲ء،ص۱۸۸

امجد رضا
اُستاد شعبہ سرائیکی، گورنمنٹ ڈگری کالج سمہ سٹہ
ڈاکٹر طاہر عباس طیب
استاد شعبہ اُردو، جی سی ویمن یونیورسٹی ،سیالکوٹ

# سرائیکی سی حرفی موضوعاتی مطالعہ

## Subjective study of Saraiki Say Harfi

The history of any society or any nation remains incomplete without folk literature. Folk literature represents social, political, economical and psychologial trends of its age. Saraiki poetry, in the form of C-Harfi, based upon religious and mystic poetry, ca still be found treasured up. This genre is equally popular in Saraiki, Punjabi and Sindhi its individuality among the rest. Its themes are the oneness of Allah, love for the last prophet, the feeting nature of this world, social representation, human psychology, morality, love and beauty. Such themes render it unique and everlasting .

**Keywords:** *Saraiki Say-Harfi, Folk Literature, Love of Allah and Prophet, Love and Beauty.*

کسی قوم یا سماج کی تاریخ لوک ادب کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔لوک ادب ماضی کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔اس کی ذریعے کسی قوم کی نفسیاتی، روحانی یا مذہبی حالت، وہ قوم کیسا سوچتی تھی، پیداوار کے ذرائع کس کے قبضے میں تھے ' ظالم اور مظلوم کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔عوام کی ضروریات، آس امید کن قوتوں کے ہاتھوں نامکمل رہ جاتی ہے، کی بارے بھی پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد مذہبی ادب کی باری آتی ہے۔اس کی ابتدا تبلیغ کی ضروریات کے پیش نظر وجود میں آئی۔ دل کی بات کہنے کے لیے شعر و شاعری بہترین ذریعہ رہا ہے۔بات کو مفصل مگر بامعانی بیان کرنے کے لیے مبلغین نے اشعار سے مدد لی۔ خاص طور پر انہوں نے شعر و شاعری کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کیونکہ ہندوستان آئے بہت سے صوفیہ کی زبان فارسی اور عربی تھی مگر انہوں نے تبلیغ کے لیے مقامی زبانوں کا سہارہ لیا۔

صوفی شاعری کا ابتدائی ذخیرہ زیادہ تر "سی حرفی" کی شکل میں موجود ہے۔ اگرچہ اس کے لیے دوہڑہ' کافی' بارہ ماسی ' ڈھولے' بیت' ستوارہ' اور گنڈھاں جیسی اصناف استعمال کی جاتی تھیں۔ سی حرفی سندھی' پنجابی اور سرائیکی میں یکساں مقبول صنف ہے۔ڈاکٹر لاجونتی "سی حرفی" کے متعلق کہتی ہیں کہ اس کا ماخذ خالصتاً پنجابی ہے

اگرچہ فارسی اور عربی ادبیات کی کئی اصناف سخن اس زبان میں رائج ہیں۔ان کا خیال ہے کہ آدی گرنتھ میں سی حرفی کی قدیم نمونے پائے جاتے ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

> Siharfi is an acrostic on the alphabet. It is not found in any other Indian language. As it is not of Persian or Arabic origin we conclude that it is a Panjabi form. The oldest verse of this kind is found in the Adi Granth of the Sikhs and was composed by Arjuna Dev. Later on it appears to have become a popular verse-form of the Sufis. Some of them wrote more than two or three siharfis. Siharfi Precisely, is not a short poem but is a collection of short poems. The letters of the alphabet are taken consecutively, and words whose initials they form are employed to give metrical expression to the poet's ideas.(1)

سی حرفی میں ابجد کے ہر حرف سے شروع کر کے تین مصرعوں' چار مصرعوں یا اس سے کم و بیش مصرعوں کی شکل میں بند مکمل کیا جاتا ہے۔اکثر چار مصرعوں کا ایک قطعہ لکھا جاتا ہے۔اس میں ہیئت اور موضوع کی قید نہیں ہوتی۔زندگی کا کوئی بھی تجربہ' مشاہدہ' کیفیت' کسی احساس کی پرچھائیں' جذبے کا کوئی پہلو اس صنف کی مصرعوں میں سمویا جا سکتا ہی۔سی حرفی کی آخری مصرعہ میں شاعر اپنا تخلص اس رعایت سے استعمال کرتا ہے جس سے محض ملکیت شعر ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس میں شاعر اپنی ذات سے بعض اوقات عالم انسانیت سے مخاطب ہو کر "کہنے کی بات" بھی کہہ دیتا ہے۔یوں کہیے آخری مصرعہ سے اس کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اصطلاح میں "سی حرفی" نظم کی وہ شکل ہے جس میں حروف تہجی کی اعتبار سی شروع کر کے 'الف' سے 'ی' تک بند بنائی جاتی ہیں۔"سی حرفی" کی لغوی معنی تیس حروف والی کے ہیں۔"سی" فارسی کا لفظ ہی جس کے معنی تیس کے ہیں، "حرفی" سے مراد حروف ابجد کے ہیں لیکن تیس حروف والی شرط ہر سی حرفی پر لاگو نہیں ہوتی۔بعض اوقات شاعروں نے اٹھائیس حرفی بند بھی لکھے ہیں' جبکہ کئی سی حرفیاں انتیس حرفی بندوں پر بھی مشتمل ہیں۔ہر شاعر اپنے تجربے اور شعری بصیرت کے مطابق حروف ابجد کا استعمال کرتا ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید " سی حرفی" کے متعلق لکھتے ہیں:

"سی فارسی زبان کا لفظ ہی جو تیس کی معنی دیتا ہی۔ جیسے 'سی پارہ' یعنی تیس حرفوں والی ' تیس کو عربی میں ثلاثون کہتے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہی کہ عربی کے حروف تہجی یا پٹی ابجد کی تعداد ۹۲ ہی لیکن ۳۰ بنالی گئی ہے اور اس کی نسبت سے اسے سی حرفی کہا جاتا ہے"۔ (۲)

کیفے جامپوری نی اپنی کتاب "سرائیکی شاعری" میں سی حرفی کی تعریف کرتی ہوئی اُسی سرائیکی، سندھی اور پنجابی شاعری کی اہم صنف قرار دیا ہی۔

"سی حرفی سرائیکی سندھی اور پنجابی شاعری کی اہم صنف ہے۔ دوہڑا اور کافی کی طرح اس میں بھی عشق و محبت' تصوف و معرفت' حمد و نعت اور دنیا کی بے ثباتی اور نا پائیداری کے مضامین باندھے جاتے ہیں "۔ (۳)

تاریخ ادبیات پاکستان میں سی حرفی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"سی حرفی بھی کافی کی مانند پنجابی لوک شاعری کی طرز میں لکھی جانے والی مشہور شعری صنف ہے۔ یہ فارسی ترکیب ہے یعنی تیس۔ عربی حرفوں کا مرکب (تیہہ اکھری) جو الف سے لے کر ی تک چار چار مصرعوں پر مبنی ہر بند یا ٹکڑی' چو بیتا یا چو مصرعہ (رباعی) ہوتا ہے، لیکن اس کے اوزان اور بحور رباعی سے جداگانہ ہیں"۔ (۴)

سی حرفی عربی حروف تہجی کے لحاظ سے لکھی جاتی ہے۔ یہ حروف اٹھائیس ہیں "لا" اور "ے" کا اضافہ کر کے تعداد پوری کرتے ہیں۔ پاکستانی زبانوں کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی حروف ابجد کے ساتھ شعر لکھنے کا رواج رہا ہے۔ یہودی الفابیٹ نظمیں لکھتے تھے۔ انگریز شاعر 'ملٹن' اور 'ورڈز ورتھ' کے درمیانے دور میں بھی الفابیٹ سے شروع کر کے پوئمز لکھی گئی ہیں بہرحال سی حرفی نگاروں نے اپنے اپنے ہیتی تجربے کیے لیکن زیادہ تر شعرا نے سی حرفی میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف سندھی' پنجابی' سرائیکی میں طویل عرصے سے چلی آ رہی ہے اور موجودہ دور میں بھی کسی نہ کسی صورت میں لکھی جا رہی ہے۔

سرائیکی سی حرفی کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو اس میں تصّوف کا رنگ نمایاں ہے۔اس کے بعد اخلاقیات اور حمد و نعت کا رجحان پایا جاتا ہے ان کے علاوہ ہجروفراق، حسن و عشق، معاشرے کی عکاسی، فطرت کی خوبصورتی کا بیان وغیرہ جیسے موضوعات بھی موجود ہیں۔

توحید، عشق رسول،تصوف، دنیا کی بے ثباتی، نیکی کی تلقین، اخلاقیات کا درس، معاشرتی عکاسی، انسانی نفسیات، حسن و عشق اولیا کرام نے تبلیغ اسلام کے لیے مقامی بولیوں اور زبانوں میں شاعری کے ذریعے بھی عوام کو اسلامی تعلیمات کا درس دیا اور اسلام کے بنیادی عقائد اوراصول نہایت دل کش انداز میں ذہن نشین کرائے۔اسی روایت پر چلتے ہوئے عام طور پر تمام شعرا اورخاص طور پر سی حرفی نگاروں نے مذہبی اقدار کو موضوع سخن بنائے رکھا۔مذہبی شاعری میں توحید اور عشق رسول دو اہم موضوعات ہیں۔

**توحیداور عشق رسول**

یتیم جتوئی اللہ تعالیٰ کی صفات اور وحدانیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے، بے نیاز ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں اور وہی ہے جو دلوں کے راز بہتر جانتا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

الف احد ب بیحد برتر، رتبہ پ پرور دا
ت توفیق رکھیندے وحدت ہمسر ہور نہ دھردا
ث ثابت ہے قدرت قادر صادر صاحب اثر دا
ج جلال جلیل قدر بے مثل مثال نظردا
ح حاکم حق پاک حقیقی دعوے حق دا ور دا
خ خالق مخلوق تمامی مالک زیر زبردا
د دلال دلاندا والی بجھدا راز اندر دا
ذ ذبیح اللہ دے کیتے حکم خلیل تے کردا(۵)

ترجمہ: اللہ پروردگار واحد کا رتبہ سب سے بلند ہے۔اس کی ہمسری کی توفیق کسی کو نہیں۔وہ قادر مطلق ہے، جلیل القدر ہے اور بے مثال ہے۔وہ حاکمیت کا حقیقی دعویٰ دار ہے اور تمام

مخلوقات کا خالق ہے۔وہ دلوں کے راز جانتا ہے۔اس کے حکم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی ٹھان لی۔

بیدل سندھی نبی اکرم ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کی نجات کے لیے نور ہدایت لے کر آئے اور اُن کے حسن کے سامنے سورج کی روشنی ماند ہے۔

ش　شاہ　لباس　چاکاندے　وچ
مخفی　ہو　کے　جھنگ　سیال　آیا　رے
ص　صلو　علیہ　وآلہ　سوہٹنا　رے
صاحب　حسن　کمال　آیا　رے
ض　ضو　شمس　دا　چھپ　گیا
جلوہ　نور　جمال　آیا　رے(٦)

ترجمہ:　بادشاہ غلاموں کے بھیس میں چھپ کر جھنگ سیال آیا۔اس پر درود و سلام ہو اس کا حسن کمال کا ہے۔اس کے حسن کے سامنے سورج کی روشنی بھی ماند ہے ۔

اکبر شاہ خود کو ہیر اور رسول اکرم ﷺ کو رانجھا کہتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ سے ملنے کی خواہش میرے اندر تڑپ رہی ہے اور میں آپ کو تلاش کرنے کے لیے کائنات کے ہر کونے میں جانے کو تیار ہوں ۔

الف　آ　رانجھا　سک　اللہ　ساڈی　ہویم　قرب　قرین
نال　ماہی　دے　پاک　محبت　کیڑ　ھارولعین
شوقوں　یارمنایم　رانجھا　ڈھونڈ　آسمان　زمین
ان　اللہ　یحب　التوابین　ویحب　المتطہرین(٧)

ترجمہ:　اے رانجھے اللہ سے ملنے کی خواہش ہی اس کے قریب کرتی ہے۔محبوب سے پاک محبت آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرتی ہے۔شوقِ وصال ہی محبوب سے محبت بڑھاتا ہے۔اللہ تعالیٰ یقینا توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

**تصوف**

توحید اور عشق رسول کے بعد تصوف ایک اہم موضوع ہے۔ سرائیکی کلاسیکی شعرا کے کلام میں خاص طور پر متصوفانہ موضوعات جا بجا ملتے ہیں۔ تصوف کے متعلقہ موضوعات میں قرب الٰہی، فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ، زہد اور معرفت نفس اہم ہیں۔

علی حیدر ملتانی کے نزدیک نفس کومارنا اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ کے عشق میں گم ہو جانے کے لیے نفس پر قابو پانا ضروری ہے۔ اپنی ذات کو فنا کیے بغیر جنت کا حصول نا ممکن ہے۔

ب بھٹی تتی تیرے عشق والی اوہ بھڑکے تے بھاہ بھاہ کرے
عاشق سڑدے تے تڑ تڑ کر دے کول عشق کھڑا واہ واہ کرے
سلیمان بھٹیاری دا بھٹ جھلکے یوسف نال زلیخا نکاح کرے
جیہڑا اپنا آپ نہ مارے وے حیدر اوہ جنت دی کیا چاہ کرے(٨)

ترجمہ: عشق والی بھٹی میں سے عشق کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ عاشقوں کو جلتا دیکھ کر عشق مسکرا رہا ہے۔ جب تک اپنی انا کو نہ مارا جائے عشق نہیں ملتا جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا سے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھٹیارن سے شادی کر کے حاصل کیا تھا۔ اپنی ذات کو فنا کرنے کے بغیر جنت حاصل نہیں ہو سکتی۔

حضرت سچل سرمست سندھی اور سرائیکی کے معروف شاعر ہیں۔ آپ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی با عمل بھی ہیں۔ آپ وحدت الوجود کے قائل ہیں اور آپ کے نزدیک ہر قسم کی کثرت مجازی ہے۔ زمین و آسمان، سمندر، پہاڑ حتی کہ پوری کائنات میں اللہ ہی کا نور ظہور ہے :

ز زور تے بحر زخار آندا تہیں وچوں تھیا کوئی نظار کھڑا
اوہیں شور مچایا آسمان تائیں وسکار دا تھیا دو غبار کھڑا
س سیرا یہیں دا جہیں سیر کیتا تہیں دی جند ساری نا پید تھئی
کتھے نام و نشان نسب تہیں دا "من" "ما" وچولے دی پھوک گئی
ش شور مچایا وو موج ڈاہڈاہئے زور جھلن دی ووجا نہیں
برابر زمیں اسمان کتیئس ڈتی کنی تہیں دی وو کا نہیں
ص صورت گم ہوئی وو ساری لہریں پیاپئے وو چڑھ پئیاں

کائی خبر انھاں وو پوندی نہیں نور و نور دیاں ندیاں آنیاں
ض ضرب بحری دی وو زور لگی ہکے وار وجود او ڈار ڈتس
"میں" دی ہک رتی کتھ رہندی اتھاں سارا نام نشان اتار ڈِتس (۹)

ترجمہ: جب جوش سمندر میں آیا اس میں تھا کوئی نظار کھڑا، وہ شور تھا اس کا، جو، بن کر افلاک تلک تھاغبار کھڑا، دی جان اسی نے جس نے ہمارے دل کو اطمینان دیا، نے نام و نسب تے حیات کوئی نہ اس نے کوئی نشان دیا، وحدت کے سمندر کی موجیں کیا شور مچاتی پھرتی تھیں، دھرتی سے لے آکاش تلک کوئی فرق رہا تھا؟ نہیں نہیں، وحدت تھی کثرت میں کھوئی کثرت کی موجیں چڑھ دوڑیں، ان چڑھتی نور کی ندیاں میں سب اصلی باتیں کھو ڈالیں، اس بحر کے ایک تھپیڑے نے اس ہستی کو ہی مٹا ڈالا، اس "میں" کی رتی کیا رہتی اس بستی کو ہی مٹا ڈالا۔

حضرت سلطان باہو عالم اور صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔آپ کی شاعری میں شریعت پر کاربند رہنے کی تلقین، مرشد سے عقیدت، حب رسول، عشق الٰہی، اخلاقیات اوردیگر سماجی و معاشرتی اقدار کا درس ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ انسانی جسم میں اللہ کا گھر ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کا قرب چاہتے ہو تو انسان سے محبت کرو۔

ایہہ تن رب سچے دا حجرہ اندر پا فقیرا جھاتی ہو
نہ کر منت خواج خضر دی تیرے اپنے اندر آب حیاتی ہو
شوق دا دیوا بال انھیرے متاں لبھی وست کھڑاتی ہو
مرن تھیں مر رہے اگے باہو جنہاں حق دی رمز بجھاتی ہو(۱۰)

ترجمہ: اے فقیر اندر جھانک کر دیکھو یہ جسم خدا کا گھر ہے۔ آب حیات تیرے اندر موجود ہے لہٰذا خضرؑ کی منتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ شوق کی شمع جلا کر کھوئی ہوئی منزل تلاش کرنے کی کوشش کرو۔اے باہوؒ جنہوں نے حق کا اسرارپا لیا وہ موت سے بھی آگے گذر گئے۔

حمل لغاری کے نزدیک محبوب کا ملنا ہی نصب العین ہے اور جب محبوب کا قرب نصیب ہوتا ہے تو حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے اور محبوب کا دیدار حج کے ثواب کے برابر ہے ۔

لا لاہ حجاب لنگھ دوست آیا
تن من میڈا مسرور تیھا
خوشی خوب تھئی محبوب ملیا
سہیو سوال میڈا منظور تھیا
جسے سیر کنوں بھر پیر آیا
اہو سیر کلی پُر نور تھِیا
حمل حب والا محبوب ملیا
ساکوں حاصل حج حضور تھیا(١١)

ترجمہ: میرا محبوب حجاب کھول کر آن پہنچا تو میرا دل مسرور ہو گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری خواہش کے مطابق محبوب سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے جہاں جہاں قدم رکھا وہاں وہاں روشنی پھیل گئی۔ اے حمل محبوب ملنے پر یوں محسوس ہوا جیسے حج کر لیا ہو۔

## دنیا کی بے ثباتی

صوفی شعرا نے دنیا کی بے ثباتی کا بیان اپنی شاعری میں بکثرت کیا ہے۔ ان کے نزدیک دنیاوی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ خواب و خیال ہے، وہم ہے اور عارضی ہے۔ حقیقی زندگی اخروی ہے جس کے لیے ہمیں ابھی سے تیاری کی ضرورت ہے۔

شیخ عبداللہ ملتانی کہتے ہیں کہ دنیاوی مال و دولت، ریشمی لباس، سونے چاندی کے برتن، گھر، محل، باغ وغیرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ان تمام اشیاء کو آخر کار ختم ہونا ہے۔ بلکہ موت ان تمام چیزوں سے رشتہ ختم کرا دیتی ہے۔ انسان کو اس دنیا کی نہیں آنے والی کی فکر کرنی چاہیے۔

ز زر بفتی جیندے جوڑے
توڑے ہاتھی توڑے گھوڑے
توڑے چاندی توڑے کٹورے
تاں بھئی موت چکھیسیا
سمجھ بندی توں نال فکر دئے ایہ جندڑی پردیسیا
س سدا نہیں باغ بغیچے

سدا نہ ھوندے فرش غلیچے
ھر دم فکر چلن دا کیجئے
اوڑک موت لٹیسیا
سمجھ بندی توں نال فکر دئے ایہ جندڑی پردیسیا(۱۲)

ترجمہ: جو ریشمی لباس پہنتا ہے، جس کے پاس مال و دولت ہے وہ بھی آخر موت کے منہ میں جائے گا۔یہ دنیا، باغ، باغیچے، قالین والے فرش ہمیشہ نہیں رہیں گے۔آخر کار موت انہیں لوٹ لے گی۔اے انسان غور کر یہ زندگی عارضی ہے۔

ناطق ملتانی نے ڈھولا کی ہیئت میں سی حرفی لکھی ہے اور اس میں دنیا کی بے ثباتی کا مفصل اظہار کیا ہے۔آپ انسان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ وہ موت کو بھلا بیٹھا ہے۔اسے قبر کا کوئی خوف نہیں رہا۔اسے اس بات کا احساس نہیں کہ موت کا فرشتہ اس کی گھات میں بیٹھا ہے۔اس کی ساری دوستیاں اور رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔اس کا مال و دولت اس کے کام نہ آئیں گے۔اس کا نام و نسب اس کے لیے بے کار ہو گا۔صرف ایک چیز اس کے لیے فائدہ مند ہو گی اوروہ ہیں اس کے اعمال۔

ق قرب اجل دا پیوے خون بدن دا
خاطر خاطر تھیسی فرشتہ جان کندن دا
وسریاہے غافل تیکو ٹوٹا جے کفن دا
ناطق یاد نہ کیتو ویلا وقت ونجن دا(۱۳)

ترجمہ: موت کی قربت بدن کا خون چوستی ہے۔ملک الموت جلد ہی حاضر ہو جائے گا۔ اے غافل تجھے کفن کا پہننا یاد نہیں اور نہ ہی تجھے مر جانے کا وقت یاد ہے۔

**اخلاقیات کادرس**

دنیا کے تمام مذاہب، چاہے الہامی ہوں یا غیر الہامی، تبلیغی ہوں یا غیر تبلیغی، سامی ہوں یا غیر سامی، اپنا اپنا اخلاقی نظام رکھتے ہیں۔اگر تمام نہیں تو چند بنیادی اخلاقی اقدار تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور تمام ہی مذاہب میں اخلاقی درستگی پر زوردیا گیا ہے۔اس اخلاقی نظام کے زیر اثر شعرا نے بھی اپنے کلام میں اخلاقیات کو موضوع سخن بنایا ہے اور سرائیکی سی حرفی نگار اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

نور احمد سیال ایک معاشرتی بداخلاقی چوری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس بداخلاقی کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے اور نہ ہی یہ چیز اخلاقیات میں پسندیدہ ہے کہ اس بداخلاقی کے مرتکب شخص سے لاپرواہی برتی جائے۔

چ چے چوری دل دلبر نیتا
کہیں دا لحاظ نہ اصلوں کیتا
چور کوں ڈیکھ کے منہ پے سیتا
نور کنوں بس منہ نہ بھنوا

اخلاقیات کا اصول ہے کہ گناہ کرنے کے بعد اس کی اشاعت مزید گناہ ہے اور یہ معاشرتی بداخلاقی ہے کہ گناہ کر کے اس پر فخر کیا جائے اور دوسروں کو بتایا جائے۔

ذ ذال ذخیرہ ئی گنڈھ گناہ دا
سر تے چاتو جو پنڈ گناہ دا
کینویں بھریسیں ڈنڈ گناہ دا
روزِ جزا اے نور ڈسا(۱۴)

ترجمہ: اے انسان تو چوری کی نیت کرتا ہے اور کسی کو نہیں بخشتا بلکہ چور کو دیکھ کر اسے چور بھی نہیں کہتا۔تو کیوں ہدایت سے منہ پھیرتا ہے۔اے انسان تو گناہوں کا انبار ہے اور گناہوں کا انبار اٹھائے ہوئے ہے۔اے نور تو یہ تبا کہ روز جزا گناہوں کے انبار سے کیسے نپٹے گا۔

محمد بخش محمدن صدق و صفا پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

الف اللہ کوں یاد کر بھلا بیلیا ایسے تیرے کم
سڈ گہتہ کوڑ پلال نوں بھلا بیلیا نکل جاسیا دم
ب بہت محبت نال توں بھلا بیلیا دامن پھڑتوں رسول

صدق صفائی دلدی بھلا بیلیا کرتوں دین قبول
تک تکڑا ہو کے بھلا بیلیا من توں چارے یار
بیڑی چڑسیں دین دی بھلا بیلیا آخر لہنگسیں پار
ث ثابت نال صدق دے بھلا بیلیا رکھتوں صاف یقین
اسوچ فرق نہ جانتوں بھلا بیلیا راضی ہوئے امین(۱۵)

ترجمہ:اے اچھے دوست اللہ کو یاد کر۔ جھوٹ کو چھوڑ دو کہ آخر تو نے آگے جانا ہے۔تو محبت کے ساتھ دامن رسول پکڑ لے اور دل میں صدق اور صفائی پیدا کر۔یقین کے ساتھ چاروں یار (خلفائے راشدین) پر ایمان لے آ تاکہ تیری کشتی پار اترے۔تو صدق و صفا کے ساتھ دین قائم رکھ۔

**حسن وعشق**

حسن و عشق شعرا کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ بعض لوگوں کاخیال ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کی پہلی سیڑھی ہے اوراکثر صوفیہ کرام اسی سیڑھی کے ذریعے عشق حقیقی تک پہنچے۔ جمالیات کی حس انسان میں جبلی طور پر موجود ہے۔انسان ہر خوبصورت چیز کی جمالیاتی حس پر قائم ہے۔کیوں کہ انسان پہلے کسی شے کی خوبصورتی اور حسن سے متاثر ہوتا ہے، چاہے یہ حسن ظاہری ہو یا باطنی اور پھر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حصول کی یہی خواہش عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے جو کہ خواہش قرب کا آخری درجہ ہے۔سرائیکی سی حرفی لکھنے والے بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔

بیدل سندھی معشوق کے فراق کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے بغیر عاشق کی حالت خستہ ہوتی ہے۔راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا ہے۔اس کی جدائی میں غمگین گیت گاتا ہے۔آپ فراق کی حالت میں یوں بیان کرتے ہیں:

الف آسوہٹنا سنط حال میڈا تیڈے باجھ بہوں درماندیاں میں
راتیاں آب اکھیاں توں نت وہے ڈینہاں خون جگر دا کھاندیاں میں
سر ندا درد غماندا دست دھرے سر سوز فراق دا گاندیاں میں
بیدل بار برہا درباری چم چاہ کنوں سر چاندیاں میں (۱٦)

ترجمہ: اے محبوب دیکھو تیرے بغیر میرا برا حال ہے۔ رات کو آنسو نہیں رکتے اور دن کو درد جگر ستاتا ہے۔ میں مسلسل غمگین سروں میں درد بھرے گیت گاتی ہوں۔ اے بیدل جدائی کے صدمات نے میرا سر جھکا دیا ہے۔

بخت فقیر سئیں عشق میں مبتلا لوگوں کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں وہ ہر وقت محبوب کے انتظار میں رہتے ہیں۔ وہ عیش و عشرت بھول جاتے ہیں۔ اپنے عزیز و اقربا اور وطن تک کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ سب لوگوں کے طعنے بخوشی سنتے ہیں اور چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے، عشق سے باز نہیں آتے۔ آپ لکھتے ہیں:

ج جیڑھیاں عشق دی وَٹھ وچ آیاں ودیاں اجنئیں کانگ اڈیندیاں
سٹ عیش امن کل خویش وطن ناں یار دانت پکریندیاں
کل ہنے طعنے خلقت والے پڑھ بسم اللہ کر چیندیاں
توڑیں بختا ہجر ہلاک کرے نہ یار دی تار چھوڑیندیاں[١٧]

ترجمہ: جو عشق کے جال میں پھنستے ہیں ہمیشہ انتظار میں رہتے ہیں۔ عیش و عشرت، عزت و رشتہ داریاں سب کچھ بھلا کر محبوب کا ہی نام لیتے رہتے ہیں۔ لوگوں کے طعنے بخوشی سنتے ہیں۔ چاہے جدائی انہیں ہلاک ہی کیوں نہ کر دے وہ عشق سے باز نہیں رہتے۔

علی حیدر ملتانی حسن کے بیان میں مہارت رکھتے ہیں۔ لڑکیوں کے ایک جھرمٹ کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ک کڑیاں دی گل تدن بجھاتی جدوں کڑیاں کلیجہ نوں اڑیاں نے
چھنکار کلیجوں پار گیا، کسے ظالم سنار نے گھڑیاں نے
اک کڑیاں ظالم دُوجا گھڑیاں ظالم تیجا ظالماں دے پیریں جڑیاں نے
علی حیدر وے تینوں کیوں نہ ساڑن جیڑھیاں آپ آتش وچ سڑیاں نے
ح حوراں ویکھ جمال سجن دا سنگدیاں سنگدیاں سنگ گئیاں
ہکو نظارہ برائے خدا دے منگدیاں منگدیاں منگ گئیاں
چونی نوں مکھنط تے پیراں نوں مہندی رنگدیاں رنگدیاں رنگ گئیاں
ایہہ دو زلفاں دا شمس وے حیدر ڈنگدیاں ڈنگدیاں ڈنگ گئیاں[١٨]

ترجمہ:　لڑکیوں کی بات تب سمجھ آتی ہے جب وہ گلے پڑ جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے انہیں کسی ماہر سنار نے مہارت سے بنایا ہے۔ ایک تو وہ ظالم ہیں دوسرا وقت مشکل اور تیسرا ان پر ظالموں کا قبضہ ہے۔ اے علی حیدر جو خود آتش ہوں وہ تجھے کیوں نہ جلائیں۔

خوبصورت لڑکیوں نے جب محبوب کا چہرہ دیکھا تو شرما گئیں۔ وہ خدا سے اس کے ایک نظارے کے لیے دعا کرنے لگیں۔ سر پہ مکھن اور پیروں میں مہندی لگائے کائنات کو رنگین بنا رہی ہیں۔ اے علی حیدر ان کی زلفیں ناگن کی طرح ڈس رہی ہیں۔

ہم عصر سی حرفی میں موجودہ حالات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جگہ جگہ بم دھماکے ہو رہے ہیں۔ شاعر نے اس کو سادگی سے اپنے الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ دراصل سرائیکی شاعری میں شعرا ہمیشہ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوئی طریقہ نکالتے رہے ہیں۔ بامقصد شاعری ہی معاشرے کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ صوفیا شعرا نے سی حرفیاں لکھ کر اپنے دل کی بات عام لوگوں تک پہنچانے کی سعی کی۔ امید ہے کہ نئے شعرا غزل' دوہڑہ' ہائیکو' کافی کے ساتھ ساتھ اس اصلاحی اور مذہبی شاعری کو بھی اپنے کلام میں شامل کریں گے۔ بزرگ شعرا اور صوفیہ کی اصلاحی صنف کی روایت کو تسلسل کے ساتھ رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ Lajwani Ram Krishna, Punjabi Sufi Poets, Indus Publications, Karachi, 1977,pages-xxiii-xxiv

۲۔ انعام الحق جاوید، پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء، ص ۳۱۷

۳۔ کیفی جامپوری، سرائیکی شاعری، ملتان، بزم ثقافت ۱۹۶۹ء، ص ۱۹۴

۴۔ اسرار احمد کیپٹن، تاریخ ادبیاتِ پاکستان، جلد نمبر ۱۳ لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ص ۷۳۰-۷۲۹

۵۔ یتیم جتوئی، غلام حیدر خاں، در یتیم، ملتان، سرائیکی اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ص ۲

۶۔ قادر بخش بیدل، منتخب سرائیکی کلام بیدل سندھی، ملتان، بزم ثقافت، ۴۔ مائی مہربان چوک فوارہ، ۱۹۷۸ ص ۱۱۴

۷۔ اکبر شاہ، مجموعہ، لاہور، اسلامیہ سٹیم پریس، س ن، ص ۱

۸۔ علی حیدر، لعل ہیرے، ص ۱۴

۹۔ سچل سر مست، سچل سر مست، سندھی، پنجابی، فارسی اور اردو کلام، مرتب: شفقت تنویر مرزا، اسلام آباد، لوک ورثہ اشاعت گھر، ۱۹۸۷ء، ص۳۲۸
۱۰۔ محمد بشیر چوہدری، ابیات سلطان باہوؒ، لاہور، تاج بک ڈپو، اردو بازار، ۱۹۷۲ء، ص۱۵
۱۱۔ حمل خاں لغاری، حمل لغاری، مرتب محمد اسلم رسولپوری، ملتان، بزم ثقافت، محلہ مائی مہربان، ۱۹۸۱ء، ص۱۱۹
۱۲۔ شیخ عبداللہ ملتانی، جنڈری پردیسی، ملتان، اندرون بوہڑ گیٹ بازار، کتب فروشاں، س ن، ص۳
۱۳۔ ناطق، سی حرفی ڈھولا ناطق، ملتان، سیرانی پبلشنگ کمپنی، اندرون بوہڑ گیٹ، س ن، ص۴
۱۴۔ نور احمد سیال، پاک سی حرفی، ص ص۱۱، ۶، ۴
۱۵۔ محمد بخش محمدن، مجموعہ فراق عشق، لاہور، مطبوعہ مجتبائی پریس، س ن، ص۲
۱۶۔ قادر بخش بیدل، منتخب سرائیکی کلام بیدل سندھی، ص۱۱۶
۱۷۔ بخت فقیر سائیں، دان پنجتنی، کراچی، المخزن پرنٹرز ۹۸۹۱ء، ص۳۸
۱۸۔ علی حیدر، لعل ہیری، ملتان، ہمدرد پرنٹر پریس، ۱۹۷۳ء، ص۱۵

پروین صادق
اسکالر پی ایچ ڈی اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

# عرب دنیا میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال

## Current Situation of Urdu Literature in Arab Countries

Urdu Language & literature has a vast acceptability in the Asian communities. When Urdu language & literature went to Arab countries, there was a different atmosphere altogether but it made its place in many areas. Many Arab people contributed for development of Urdu literature in their countries. Various types of Urdu literature were introduced there but most of the Urdu speaking community in Indo- Pak is not aware of it. An effort has been made in this article through the research conducted by me to reflect upon the variety and progress of Urdu literature in Arab countries.

**Keywords:** *Indian Subcontinent, Evolutionary Stages, Identity, Repeatedly, Traditional Restrictions, Atrocity.*

اردو زبان و ادب کی بنیادی جڑیں برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں ہیں۔ لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عرب و ہند کے روابط کے ذریعے اس کا بیج عرب سرزمین میں پہنچا۔ عرب کے صحراؤں میں صدیوں کا عمل اس کے وجود کو تلاشتا ہے۔ گویا اردو زبان اپنے ارتقائی مراحل میں تھی جب زمین عرب سے اس کا پودا نمودار ہوا، تو صحراؤں کی جھلسا دینے والی دھوپ، مشقت کی چکی، ہجرت کے کرب، اپنوں کی دوری اور شناخت کی تلاش جیسے عوامل نے اس پودے کی آبیاری کی۔ آہستہ آہستہ یہ پودا بارور درخت کی صورت اختیار کر گیا لیکن بلاد عرب میں جنم لینے والے اردو ادب کے خمیر میں مذکورہ بالا موضوعات رچ بس گئے ہیں اور زیادہ تر تخلیقات انہی مضوعات کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ بلاد عرب میں تخلیق ہونے والا ادب ہیت کے نئے تجربوں کے ساتھ ساتھ روایتی پابندیوں اور جدید سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے۔

عرب ممالک میں اردو ادب کا بنیادی وجود کسی خاص نظریے کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ پردیس میں دن بھر محنت مزدوری کرنے کے بعد جب اپنوں سے دوری کا احساس ستانے لگا تو ادب وجود میں آنے لگا۔ فنکار حساس ہوتا ہے، وہ معاشرے کے ظلم و گراوٹ کو ایک عام انسان سے دوگنا محسوس کرتا ہے۔ ایسے تلخ حقائق کی بدولت وجود میں آنے والا ادب ہی فن کا نمونہ اور شاہکار ہوتا ہے۔

عرب دنیامیں اردو ادب کی موجودہ صورتحال پر ایک نظر ڈالی جائے تو اردو ادب کا میدان ہرا بھرا لہلہاتا اور سرسبز دکھائی دیتا ہے۔ اس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں مگر اس لہلہاتے میدان میں کوئی محقق خوشے چننے تاحال نہیں گیا۔ ہاں کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر سے گزرے تو وہاں کے پھولوں کی مہک لے آتا ہے مگر سرسری نظر کبھی بھی کسی چیز کا کامل احاطہ نہیں کر سکتی۔ عرب دنیا میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال ابھی وسیع تحقیق کی متقاضی ہے۔

اردو زبان جسے مسلمانوں کی زبان کہا گیا کیونکہ یہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ صدیوں کھیتوں کھلیانوں اور گلیوں کوچوں میں پروان چڑھنے والی یہ زبان آج عرب ممالک میں اپنے ملک "پاکستان" کی شناخت بن رہی ہے۔ عرب دنیا میں اردو کا عروج در حقیقت پاکستانی قوم کا عروج ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری

> "کسی زبان کے عروج و زوال کی داستان کو دراصل کسی قوم کے عروج و زوال کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ ہمارے سامنے چین، ملائشیا اور دیگر ممالک ترقی کی روشن مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے علوم کو ترقی دی اور اس مقصد کے لیے اپنی قومی زبانوں کا سہارا لیا"۔[1]

درحقیقت زبان کسی بھی ملک کی تاریخ تہذیب و تمدن اور روایات کی امین ہوتی ہے۔ زبان جہاں باہمی رابطے اور ابلاغ کا ذریعہ ہوتی ہے وہاں کسی قوم کی امنگوں کی ترجمان بھی ہوتی ہے۔ دنیائے عرب میں جہاں لق و دق صحرا تھا، دور دور تک پانی کا کوئی چشمہ ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ مسافر کئی کئی روز پیدل یا جانوروں پر سفر کرتے تھے۔ پانی کا ذخیرہ ختم ہونے پر یا تو جان کے لالے پڑ جاتے تھے یا کہیں نہ کہیں سے پانی ڈھونڈ کر آگے سفر جاری رکھا جاتا تھا۔ ایسے میں زمین کھودنے پر تیل نکلتا۔ آہستہ آہستہ عرب کے بدوؤں کو معلوم ہوا کہ یہ تیل پانی سے مہنگا اور قیمتی ہے۔ انھوں نے اس تیل کو دنیا کے کارخانے میں کارآمد بنا کر بیچنے کا سوچا اور یہ تیل خریدنے کے لیے کئی خریدار صف بنائے کھڑے تھے۔ ایسے میں عرب دنیا نے غریب ملکوں کی افرادی قوت حاصل کی۔ اس افرادی قوت میں پاکستان کے لوگ بھی شامل تھے۔ عرب ممالک میں اگر دیگر قوموں کا شمار کیا جائے تو پانچویں نمبر پر آنے والے ہندوستانیوں سے پاکستانیوں کی تعداد زیادہ ہے۔

عرب ممالک کی زبان "عربی" ہے لیکن خلیجی ممالک کے بیشتر باشندے اردو بول سکتے ہیں۔ خود اہل عرب مسلمان پاکستانیوں سے محبت اور انس رکھتے ہیں۔دیگر قوموں کی نسبت ان کا میل جول اور باہمی روابط زیادہ تر پاکستانیوں کے ساتھ ہے۔اس کی واضح مثال عربی لوگوں کی پاکستان یا ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں سے شادیاں کرنا ہے۔عرب ممالک میں اردو کو مروجہ زبانوں میں اہمیت حاصل ہے لیکن سرکاری زبان عربی ہے۔اسی طرح بین الاقوامی زبان ہونے کے ناطے انگریزی دوسرے نمبر پر ہے ۔لہذا اردو وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔

عرب خطوں میں اردو ادب کی باقاعدہ ابتدا تیل کی دولت دریافت ہونے کے بعد عمل میں آئی ۔عرب ممالک میں سب سے زیادہ تعداد مسلمان پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی ہے۔یہ لوگ اپنا اور اپنے اہل و عیال کے پیٹ کا دوزخ بھرنے عرب ممالک میں گئے۔جہاں تپتی دوپہریں اور جلتی ریت ان کا استقبال کرتی تھی۔وہاں یہ محنت کش طبقہ جب دن بھر کے کام سے تھک جاتا تو آپس میں مل بیٹھتا اور اپنی ماں دھرتی اور پیاروں کی جدائی کا روگ انہیں گیت الاپنے کی طرف مائل کر دیتا، یوں دن بھر کی تھکن شعر و شاعری میں ڈھل جاتی اعصاب اور روح اس عمل سے یک گونہ سکون پاتے اور سکون حاصل کرنے کا یہی عمل اردو ادب کی تخلیق کا باعث بنااور یوں اردو ادب کی تخلیق ہونے لگی ۔

عرب ممالک میں جب تیل کی دریافت ہوئی اور تیل کے کنویں کھودے گئے تو عرب حکمرانوں نے دنیا بھر کے ہنر مندوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا عربوں کے پاس وافر مقدار میں پیسہ آیا تو پیسے کا مصرف بھی سمجھ میں آگیا۔ اور یوں ویران صحراؤں کو گلزاروں میں تبدیل کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے لگا۔ بلند و بالا آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتوں کی تعمیر کے منصوبے عمل میں آنے لگے۔افرادی قوت کم پڑنے لگی۔تو مزید افرادی قوت حاصل کرنے کے لئے ایک بار پھر غریب ملکوں کی طرف رجوع کیا گیا اور یوں دنیا بھر کے خطوں کے علاوہ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش سے بہت سے ہنر مند افراد نے عرب ممالک کا رخ کیا۔ درہم و دینار کے لالچ میں دیگر محنتی ہاتھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے عرب ممالک کو دنیا کے ترقی یافتہ اور مالدار ممالک کی صف میں لا کھڑا کیا اور آج عرب میں خصوصاً متحدہ عرب امارات دوبئی میں دنیا کی سب سے بڑی عمارت برج خلیفہ کی صورت کھڑی اہل ہنر کے فن و مہارت کو داد دیتی اور دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ اپنی جانب کھینچتی نظر آتی ہے۔

عرب ممالک کی اس ساری ترقی کے پیچھے محنت کشوں کی جانفشانیاں ہیں۔دنیائے عرب میں ایک طرف عظمت آدم تپتے جزیروں پر اپنے قدم رکھ رہی تھی تو دوسری طرف تھکے ذہن جب رات کو اکٹھے بیٹھتے تو اپنے من کی باتیں کر کے دل کو بہلاتے۔اہل پاکستان کی قومی زبان اردو ہےاور عرب ممالک میں پاکستانیوں کی تعداد بھی باقی ممالک کے مزدوروں سے زیادہ تھی۔ چنانچہ غیر محسوس طریقے سے اردوادب کی جڑیں دنیائے عرب کی سرزمین میں پھوٹنے لگیں۔آپس کی محفلوں میں شاعری اور کہانیاں سنائی جانے لگیں ۔آہستہ آہستہ شعری مجموعے،افسانے اور کہانیاں تخلیق ہونے لگیں اوریوں ادب کے پودے کی جڑیں روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں ۔آج اردو ادب پورے وجود کے ساتھ گھنے اور تناور درخت کی صورت دنیائے عرب پہ کھڑا اپنی گھنی چھاؤں اور تازہ پھل پھولوں سے لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔محمد حنیف شاہد لکھتے ہیں:

> "سعودی عرب کے مختلف شہروں میں اردو جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہے۔دکانوں اور ہوٹلوں پر اردو میں تحریر کردہ سائن بورڈ،تختہ ہائے اعلانات،بازاروں اور گلی کوچوں سے سنائی دینے والی پاکستانی اور اردو نغموں کی آوازیں اور موسیقی کی دھنیں اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔خاص طور پر جدہ،مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں تو انسان یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ لاہور میں ہو"۔[٢]

سعودی عرب ہو یا متحدہ عرب امارات ،قطر ہو یا عمان،شام ہو یا کویت و بحرین ان سب عرب ممالک میں اردو ادب کی ترقی اپنے تدریجی ارتقا کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔دنیائے عرب میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے ہم بالترتیب سعودی عرب متحدہ عرب امارات ،قطر،عمان، شام، کویت، اور بحرین اور دیگر ممالک کا علیحدہ علیحدہ جائزہ پیش کریں گے تا کہ اردو ادب کی موجودہ صورتحال کھل کر سامنے آئے۔

سعودی عرب : سعودی عرب کا کل رقبہ ٢،١٤٩،٦٩٠مربع کلو میٹر ہے ۔اس کی آبادی ١٦٠٠٠،١٤٠،دارلحکومت "ریاض" ہے اور مرکزی زبان" عربی" ہے۔

سعودی عرب میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا سہرا ان اداروں کا مرہون منت ہے جنہیں وہاں مقیم پاکستانی برادری کی سرپرستی حاصل ہے۔پاکستان ایمبیسی سکول اور کالج جدہ،ریاض،طائف اور الخبر

میں اردو زبان و ادب کی تدریس جاری ہے۔ایمبیسی ،کالج جدہ اپنی تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات بھی انجام دے رہا ہے ۔" بزم ادب " کی صورت میں ادب وہاں پروان چڑھ رہا ہے۔دوسرے نمبر پر پاکستانی انٹرنیشنل سکول و کالج جدہ،طائف،الخبر اور ریاض ہیں ۔ محمد حنیف شاہد اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> " ملک صاحب پاکستان کے شیدائی اور اردو کے دل دادہ ہیں اور اردو اور پاکستانیت کے فروغ کے لیے دن رات کوشاں رہتے ہیں ۔اس درسگاہ میں انگریزی ذریعہ تعلیم شروع کرنے کے لیے بہت کوششیں ہوئیں لیکن ملک صاحب نے انگریزی پر اردو کو ترجیح دی"۔(٣)

ایمبیسی سکول وکالجوں کے علاوہ سعودی عرب میں اہل فن کی مجالس بھی اردو زبان و ادب کی ترقی کا سر چشمہ ہیں" بزم اقبال"( ریاض)پہلی بزم ہے جس کے اجلاسوں میں پیش ہونے والے مقالات میں غالب، اقبال، فیض،اور دیگر مشاعر شعر و ادب کے علاوہ تہذیب و ثقافت اور سائنسی موضوعات پر مضامین و مقالات پیش کیے جاتے رہے ہیں۔انجمن ثقافت پاکستان (ریاض)بزم فانوس ریاض ،حلقہ ارباب ذوق،بزم اردو (جدہ)نخلستان ادب (الخبر)انٹرنیشنل اقبال ایوارڈ کمیٹی (جدہ )اقبال سٹڈی سرکل (جدہ) بزم جگر (جدہ) بزم علم و فن (جس کا نیا نام دائرہ ادب جدہ رکھا گیا ہے)،بزم اردو دمام اردو زبان و ادب کی خدمات میں پیش پیش ہیں ۔سعودی عرب میں اردو زبان و ادب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وزارت حج و اوقاف نے بڑے بڑے شہروں کی بعض مخصوص مساجد میں جمعہ کے روز بعد نماز عشا اردو میں خطبہ پیش کرنے کی اجازت دی ہے۔سعودی ٹیلی ویژن میں بعض مخصوص اوقات میں خصوصی اردو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

متحدہ عرب امارات:یہاں بھی اردو زبان و ادب اپنے ارتقائی عمل سے گزر رہا ہے۔خلیجی ریاستوں میں اردو کی مقبولیت کا محرک،معاشرتی میل جول ،مذہبی و ثقافتی اور نظریاتی ہم آہنگی ہی ہے۔ متحدہ عرب امارات کا کل رقبہ ٨٣،٦٠٠مربع کلو میٹر ہے، آبادی ٥٠١٠٠٠،ادار لحکومت ابو ظہبی ہے اور مرکزی زبان عربی ہے ۔متحدہ عرب امارات ابو ظہبی ،دوبئی،عجمان،شارجہ،ام القوین،راس الخیمہ اور فجیرہ کی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں سفارت خانہ پاکستان کا اہم کردار ہے۔ہر

ریاست میں پاکستانی ایمبیسی سکول و کالج موجود ہیں جہاں اردو کی تدریس جاری ہے ۔دیگر کئی پرائیویٹ اداروں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔متحدہ عرب امارات میں بھی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے مختلف تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔پاک ادب سوسائٹی امارات، اردو سوسائٹی بزم شعر و ادب، آرٹس پروموشن بیورو، وغیرہ ۔یہ تمام تنظیمیں اردو ادب کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں۔آرٹس پروموشن کے زیر اہتمام ۱۹۹۱میں گلف میں پہلا عربی اردو مشاعرہ منعقد کرا کے عربی اور اردو ادبا اور شعرا کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی گئی ۔پاک امارات فرینڈشپ میں شارجہ سے اپنے پروگرام شروع کیے۔پاکستان دبئی ایسوسی ایشن اردو زبان و ادب کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔پاک پنجاب کلچر ایسوسی ایشن کے علاوہ کشمیر کلچر اینڈ ویل فیئر سوسائٹی بھی اپنے پروگراموں کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔ "پیٹریوٹ پاکستانیز"کے زیر اہتمام یوم پاکستان کے حوالے سے مشاعروں کا آغاز کیا۔متحدہ عرب امارات سے شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں "روشنی اے روشنی" آہنگ کیف، مشعل جاں ،کلیات قابل،اور سحر آواز دیتی ہے، شامل ہیں۔جب کہ ڈاکٹر پیر زادہ قاسم کا نیا مجموعہ کلام ہفت آشوب ،محشر بدایونی کا "کلیات محشر" اور جون ایلیا کے انشائیوں کا مجموعہ زیر طبع ہیں۔العین یونیورسٹی کے تعاون و اشتراک سے احمد فراز کا کلیات، " اثاثہ"بھی یہیں سے شائع ہوا۔اس کے علاوہ یہاں کئی بین الاقوامی مشاعرے اور کتب کی رونمائی منعقد ہوئیں۔

متحدہ عرب امارات میں اردو زبان و ادب کی آبیاری کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں بیشتر شعرا اور ادبا شامل ہیں ۔افسانہ نگار و شاعر اسلام عظمی نے سب سے پہلے یہاں ایک سلسلہ کتب جاری کرنے کا کام شروع کیا اور"ریت اور شبنم" کے نام سےایک کتاب جو متحدہ عرب امارات کے اردو شعرا کے کلام پر مبنی تھی، شائع کرائی۔اس کے علاوہ شعری اور افسانوی ادب پر مبنی کتب کی ایک بڑی تعداد منظر عام پر آ چکی ہے جس کے نتیجے میں اردو ادب کے قارئین میں بھی بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔

متحدہ عرب امارات میں اردو رسائل و جرائد کی اشاعت کو زبردست پزیرائی حاصل ہو رہی ہے جن میں انڈیا اور پاکستان سے آنے والے ادبی مجلات بھی شامل ہیں۔خلیج ٹائمز پندرہ روزہ اردو نامہ" کے علاوہ " الشرق" اردو اخبار روزانہ چھپتا ہے۔متحدہ عرب امارات کے ایک معتبر عربی شاعر"سلطان العویس"

کے مجموعہ کلام کا اردو ترجمہ "دیوان" کے نام سے اکتوبر ۱۹۹۲میں شائع ہو چکا ہے۔ اسکا ترجمہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے کیا تھا۔متحدہ عرب امارات میں ہماری قومی زبان اردو پوری شد و مد کے ساتھ رابطے اور ابلاغ کا فریضہ انجام دے رہی ہے اور اردو زبان و ادب بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

قطر: ۱۹۵۲میں پاکستانی افراد نے قطر کا باقاعدہ رخ کیا۔۱۹۵۷کے بعد آہستہ آہستہ پاکستانیوں کی تعداد بڑھنے لگی،مقامی باشندوں کی بڑی تعداد کو غیر ملکیوں سے بات چیت کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا چنانچہ اردو عام ہوئی۔تعلیمی ضروریات

کے تحت مدرسوں کا قیام عمل میں آیا۔"پاک شمع سکول" ۱۹۶۵ میں قائم ہوا۔اس کے علاوہ پاکستان ایجوکیشن سنٹر جو ابتدا میں "پاکستانی سکول"کہلاتا رہا اس میں اڑھائی ہزار طلبہ و طالبات اردو میڈیم اور تقریباً ڈیڑھ ہزار کے قریب طلبہ و طالبات انگلش میڈیم میں پڑھتے ہیں۔۱۹۸٦میں ایک سکول اینگلو پاک بھی قائم ہوا جو اردو زبان و ادب کی خدمت میں پیش پیش ہے۔

قطر میں اردوبولنے والوں کی تعداد ۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔" پاک کمیونٹی قطر،پاکستان آرٹس سوسائٹی، مجلس فروغ اردو ادب،پاک رائٹر فورم،بمبئی کلب،اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں معاون کردار ادا کر رہے ہیں۔قطر ریڈیو کی "اردو سروس"بھی اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہی ہے۔اس کے علاوہ بزم ہم وطنان پاکستان 'حلقہ رفقائے ہند"پاک یوتھ سوسائٹی' انڈو قطر اردو مراکز قائم ہونے سے اردو زبان و ادب کی پذیرائی میں اضافہ ہوا ہے۔

بحرین:بحرین خلیجی ریاستوں میں سب سے چھوٹی ہے۔اس کی سرکاری زبان عربی ہے۔ جنکہ تجارتی زبان انگریزی ہے بحرین کی غیر سرکاری زبان اردو قرار دی جاتی ہے۔ بحرین میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بے شمار ادارے، تنظیمیں ،کمیٹیاں اور سکول کام کر رہے ہیں۔ادب کی خدمت کے حوالے سے بزرگ شاعر سعید قیس اور ان کے رفقائے کار قابل ذکر ہیں۔بحرین میں وقفے وقفے سے کچھ ادبی کتب شائع ہوئی ہیں۔ان میں شاہد علی خان کی دو کتب "رمز عشق" اور "رمز حسن" سعید قیس کی "حدیث غم""ہجر کے موسم"اور "دیوار و در"شامل ہیں۔ان تمام کتب میں "دیوار و در"کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

شام: ملک "شام"میں بھی دیگر ممالک کی طرح اردو زبان و ادب کی ترویج جاری ہے۔شام کا کل رقبہ ۱۸۵،۱۸۰مربع کلو میٹر ہے۔ آبادی ۱۱،۳۳۸،۰۰۰ہے اور دارلحکومت دمشق ہے۔عرب دنیا کے سب سے عظیم اردو دان اور پاکستان شناس شخصیت شام میں ہے۔ڈاکٹر احسان حقی صاحب ہی وہ ہستی ہیں جو شام میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا باعث بنے آپ خود بھی اردو روانی سے بولتے ہیں۔دمشق میں اردو کی باقاعدہ تدریس کا انتظام ۱۹۸۸میں ہوا۔

کویت: خلیجی ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست کویت ہے اس کا کل رقبہ ۱۷،۸۱۸ مربع کلو میٹر ہے۔آبادی ۹۵۸،۰۰۰،۱ہے دارلحکومت کویت سٹی ہے۔اور مرکزی زبان عربی ہے۔ یہاں اردو کی ترویج و ترقی کیلئے سب سے بڑا کارنامہ انگریزی روزنامے "عرب ٹائمز" کے مدیر نے انجام دیا۔انہوں نے خبروں کو اردو میں ٹائپ کروایا اور چھاپہ۔انہوں نے حکومت کویت سے روزانہ دو صفحات اردو میں چھاپنے کی اجازت لی۔کویت میں پاکستانی سفارت کاروں نے اہم کردار ادا کیا۔لوگ اپنی سفارتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ہر تقریب میں شرکت کر کے اردو زبان و ادب کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔حتی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کویت اردو ادب کی ترقی کا مرکز بن گیا۔

ریڈیو کویت بھی بلا شبہ اس ترقی کا محرک ہے کیونکہ ریڈیو کویت سے مقامی شعرا کے اردو مشاعرے نشر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے اور دیگر پروگرام اردو میں نشر کیے جاتے ہیں۔کویت میں نثری ادب بھی بڑی تیزی سے تخلیق ہوا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثری اادب مختلف سماجی و ادبی تنظیموں کے زیر اثر پروان چڑھا۔۱۹۶۳ میں کویت میں بزم ادب اردو کے نام سے قیام میں آنے والے اس ادارے نے اردو ادب کی بھرپور خدمت کی۔پاک بزم سخن بھی اس ضمن میں پیش پیش رہی۔"یاران ادب" کے زیر اہتمام رنگا رنگ اردو پروگرام نشر کیے گئے۔جو اردو زبان و ادب کی ترقی کے فروغ کا باعث بنے پاکستان آرٹس سرکل،پاکستان سنٹرل ایڈ کمیٹی،حلقہ شعور ادب، ایسی تنظیمیں ہیں جو کسی نہ کسی طرح اردو زبان و ادب کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔کویت کے پاکستانی مدارس میں بھی اردو کی تدریس و فروغ کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔جہاں سے ہزاروں طلبا و طالبات دلوں میں اردو زبان و ادب سے محبت بسائے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ اگست ۱۹۹۰ میں عراقی جارحیت نے کویت کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔کویت کو آزادی ملی تو "کویت بزم ادب" کے جیالوں نے پھر سے اردو کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔اس

طرح کویت میں ایک بار پھر سے اردو ادب کی بہار آ گئی۔اور سینکڑوں شعر و ادب کی کتب شائع ہوئیں اور کئی کتب زیر طبع ہیں۔

المختصر دنیائے عرب میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال خوش آئند ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ عرب ممالک میں یونیورسٹیوں میں بھی اردو زبان و ادب سیکھنے والے شیدائیوں کے لیے نصاب مرتب کیا جائے اور عرب یونیورسٹیوں میں اردو چیئر قائم کی جائیں تا کہ ترقی کی بڑھتی ہوئی دوڑ میں پاکستان کی قومی زبان جو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔اور جسے مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے، کہیں دیگر زبانوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔پاکستان اور عرب ممالک کے حکمرانوں کو مشترکہ معاہدے کر کے عربی اور اردو کو آگے بڑھانا چاہئے کیونکہ زبان ہی کسی قوم کی ترقی کا راز ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ جو قومیں اپنی زبان کی حفاظت نہیں کرتی وہ صفحہ ہستی سے مٹ جایا کرتی ہیں اور دنیا کی تاریخ میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ عرب ممالک میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب عرب ممالک میں اردو کا شمار دنیا کی سب سے پہلے نمبر پر بولی جانے والی زبانوں میں ہوگا۔آج دنیائے عرب میں اردو کا گلشن ہرا بھرا اور لہلہاتا ہے۔نئے اور تازہ شگوفے کھل رہے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ محقق' دنیائے عرب کی سیر کر کے اس گلشن کے گل بوٹوں کا احوال تاریخ ادب اردو کے اوراق پر سنہری حروف سے رقم کریں۔تاکہ آنے والی نسلیں عرب ممالک کی موجودہ صورتحال سے آگاہ ہو کر پاک و عرب میں تخلیق ہونے والے ادب سے فیضیاب ہو سکیں۔

## حوالہ جات


۱۔ فتح پوری، فرمان ،"اردو ہے جس کا نام" گجرات ،عزت اکیڈمی ،۲۰۰۴ء،ص۱۵۱

۲۔ شاہد محمد حنیف، سعودی عرب میں اردو" اسلام آباد ،مقتدرہ قومی زبان، ،۱۹۹۷ء۔ص۱۷٦

۳۔ ایضا" ص ۱۷۸

۴۔ الیگزینڈر بوسانی، ڈاکٹر "پاکستانی ادب کی تاریخ" میلان، اطالیہ پریس، ۱۹۵۸

۵- العویس،سلطان، "دیوان " لاہور، سعدیہ پبلی کیشنز ۱۹۹۲

٦۔ جاوید،انعام الحق،ڈاکٹر "بیرونی ممالک میں اردو" اسلام آباد ، ،مقتدرہ قومی زبان، ١٩٩٧
٧۔ حنیف فوق، "متوازی نقوش" کراچی ، نفیس اکیڈمی، ١٨٨٩
٨۔ صلاح الدین، "پاکستان زبان اور ادبیات" ترکی، استنبول ، ١٩٦٦

ڈاکٹر تحسین بی بی
استاد شعبہ اردو زبان وادب، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ،پشاور
اعظمی نورین
اسکالر، پی ایچ۔ ڈی شعبہ اُردو ، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

# کلثوم افضل زیدوی کے شعری مجموعہ ' سنگتارے ' کا فکری مطالعہ

## Thoughtful Study of Kalsoom Afzal Zaidvi Poetic Collection "Sangtary"

The poets and writers of District Swabi have written Urdu poetry side by side Pashto in different genres. There Urdu poetry was also popular. In these poets Kalsoom Afzal Zaidvi is one of great name. She works in Urdu ode, poem, quatrain and prose also. Her first poetic collections are "Sangtary".It contains her poems, odes, quatrains and rubiats. This very article presents thoughtful study of Kalsoom,s poetic collection, her topics distinctive issue of her work.
**Keywords:** *Contemporary Issues, Romanticism, Natural beauty, Modernism, To follow, Conscious Inner, Self.*

ضلع صوابی میں اردو زبان وادب میں اب تک کئی شاہکار فن پارے تخلیق ہو کر سامنے آئے ہیں۔ جنہیں قومی وعالمی سطح پر بڑے فخریہ انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ضلع صوابی کے ادبا و شعرا نے اردو شاعری کو ایک نئے انداز ورخ میں پیش کیا ہے جو قابلِ قدر اور اہمیت کے حامل ہے۔ جس دور میں یہاں اردو شاعری نے اپنے قدم جمانے شروع کئے اس دور میں صوابی میں زیادہ پشتو شاعری کا رجحان تھا۔ لیکن بہت سارے شعرا نے اُردو شاعری کی مختلف اصناف مثلاً حمد، نعت، غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اُردو شاعری کی ہر صنف کو مقبولیت عطا کی۔ ان شعرا میں عابد ودود، مولانا ابراہیم، مولانا مفتی، رضا الحق رضا، پروفیسر محمد ظاہر شاہ، فرخ نواز فرخ، فضل خالق ہمدرد، اسد گدون، سید مصطفیٰ سیفی شاہ اور اہم شاعرہ کلثوم افضل زیدوی کا نام بھی سرِ فہرست ہے انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر بالخصوص افسانے وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی اور اردو شاعری کے میدان میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ شاعری کے حوالے سے بجنوری کہتے ہیں کہ:

شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں اس طرح
شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ (۱)

کلثوم افضل زیدوی کی شاعری میں ایک طرف رومانوی فضا جھلکتی ہے تو دوسری طرف کچھ اصطلاحی رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ کلثومؔ افضل زیدوی نے شاعری کے ساتھ اردو افسانوں اور پشتو کہانیوں پر بھی کام کیا ہے۔ اور شاعری کے میدان میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

کلثومؔ افضل زیدوی کا پہلا شعری مجموعہ " سنگتارے " کے نام سے عکس پرنٹرز پشاور کے زیر اہتمام اکتوبر ۲۰۱۰ء کو شائع ہوا۔ کلثومؔ افضل زیدوی کا یہ شعری مجموعہ ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۷۰ غزلیں، ۱۳ نظمیں ۱٦ قطعات، ۱۸ اشعار، ۸ رباعیات، سوال اور ایک ہائیکو بھی شامل ہے۔ " سنگتارے " کا انتساب کلثومؔ افضل زیدوی نے اپنی ایک دوست شگفتہ معمبر خان کے نام کیا ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی کا خود کہنا ہے، کہ میں نے صحیح معنوں میں زندگی کا سلیقہ شگفتہ معمبر خان سے ہی سیکھا ہے۔ " سنگتارے " کے شروع میں ناصر علی سید نے کلثومؔ افضل زیدوی کے فن کے حوالے سے چند تعریفی کلمات کہے ہیں:

میں سمجھتا ہوں کلام کی سادگی اور پڑھنے والے کو جلدی اپنا طرف دار بنانے کی ایسی ہی صلاحیت کلثومؔ افضل زیدوی
میں بھی موجود ہے، اردو اور پشتو میں یکساں سہولت سے شعر بننے والی کلثومؔ اپنے شعر
کے حوالے سے اپنی شناخت پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ مشق سخن کے
ساتھ ساتھ فکر سخن کے مضبوط لمحات میں کہے گئے کلثومؔ کے اشعار دامن دل کھینچ لیتے
ہیں، اور یہ ہنر ایک لمبی ریاضت کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔ (۲)

"سنگتارے" کلثومؔ افضل زیدوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے متنوع موضوعات کو شامل کیا ہے، اس شعری مجموعے میں کلثومؔ افضل زیدوی نے موجودہ دور کے حالات پر قلم اٹھایا ہے۔ اور معاشرے کی ناہمواریوں کی طرف نشاندہی کی ہے۔ " سنگتارے " میں کلثومؔ افضل زیدوی نے عصری حالات خوبصورتی سے بیان کر کے ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے، وہ سنجیدہ تخلیقی فکر کے ساتھ ساتھ طرز اظہار کی بے ساختگی کو بھی اس طرح نمایاں کرتی ہیں۔

یہاں کلثومؔ راس آتی نہیں، خصلت شریفوں کی
بڑے گھاٹے کا سودا ہے شرافت چھوڑ دینگے ہم (۳)

کلثومؔ افضل زیدوی نے " سنگتارے " کا دیباچہ حرف اول کے نام سے لکھا ہے۔

میں اپنے آپ کو اس لحاظ سے بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ میرے گردوپیش میں ایک دو لوگ ضرور ایسے رہے ہیں، جنہوں نے میری تخلیقی صلاحیتوں کی طرف توجہ بھی کی ہے، اور میری ہمت افزائی بھی کی ہے ان میں کچھ میرے دوست کچھ مجھ سے چھوٹے اور کچھ بڑے لوگ۔۔ میرے محسوسات کو متحرک کرتے رہے ہیں۔ (۴)

" سنگتارے " کلثومؔ افضل زیدوی کا ایسا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ کو اپنایا ہے، اور اسی راہ پر چل کر اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے کلثومؔ افضل زیدوی نے اپنی شاعری میں ایسے موضوعات پیش کیے ہیں جو تخیلی نہیں بلکہ حقیقی اور جیتی جاگتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے کہ جس کے ذریعے لوگوں میں امن اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں۔ اعظمی قمر کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

کلثومؔ اپنے گردوپیش کے مسائل اور سنگین حقائق کا اتنا گہرا ادراک رکھتی ہیں کہ تمام نوآموز شعرا کی طرح ان کے ہاں لب ورخسار اور گل وبلبل کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا۔ وہ تلخ حقیقتیں اپنے شعروں میں سموتی ہیں۔ کہیں سخت رویوں کا ذکر کرتی ہیں کہیں طنز کا تیر چُبھوتی ہیں، اور کہیں حوصلے سے حقائق کا سامنا کرنے کی کوشش کرتی ہیں اندر کی کیفیت چُھپاتی ہیں، اور ظاہرا کہتی ہیں۔ (۵)

کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری فکری حوالے سے لاجواب ہے۔ بحیثیت مجموعی اگر اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا، کہ کلثومؔ افضل زیدوی کا اسلوب شاعری کی دنیا میں انہیں ایک منفرد اور عظیم مقام عطا کرتا ہے، ان کی شاعری میں محبت، حقیقت اور رومانیت کا احساس نظر آتا ہے۔

کلثومؔ افضل زیدوی کے بارے میں ناصر علی سید کہتے ہیں:

اگر کلثومؔ کی شاعری سے کمٹ منٹ اسی طرح جاری رہی تو جلد ہی وہ اپنا نام معتبر شاعروں کی فہرست میں درج کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اور مزید ایسے عمدہ اشعار کہہ پائے گی۔ (٦)

کلثومؔ افضل زیدوی نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔جس میں غزل، نظم ،قطعہ، رباعی، اشعار فردیات، ہائیکو اور سوال جیسی اصناف شامل ہیں، مگر کلثومؔ افضل زیدوی کی پسندیدہ صنف سخن غزل ہے کیونکہ غزل میں ہر طرح کے موضوعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ اردو ادب کی قدیم اصناف سخن میں غزل ایک اہم صنف سخن ہے، جس کے حوالے سے مختلف نقادوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے۔ بقول جمیل الدین عالیؔ:

> غزل کا ایک خاص شعری مزاج بھی ہے جس کی فضا، جذبات واحساسات مختلف النوع رخوں اور رنگوں سے تعمیر ہوئی ہے اور جس کے مرکز میں انسان کا بنیادی جذبہ عشق ایک خاص نظام اقدار سے وابستہ ہو کر غزل کی کائنات کا مرکزی استعارہ بنتا ہے۔(۷)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

> غزل اُردو کی مقبول ترین صنفِ سخن شعر ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے یا عورتوں کے متعلق گفتگو کرنا ہیں۔ ہرن کے منہ سے بوقت خوف جو درد بھری چیخ نکلتی ہے اسے بھی غزل کہتے ہیں۔(۸)

کلثومؔ افضل زیدوی کی غزل کا اگر جائزہ لیا جائے۔ تو اس میں سادگی، خلوص، سچائی، سلاست، روانی کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں، انھوں نے مشکل اور بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال کرنے سے اجتناب کیا ہے، مگر جہاں ضرورت پیش آئی ہے تو وہاں ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش کی ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی نے شاعری میں ایک الگ راہ اپنانے کے ساتھ ساتھ روایت سے بھی ناطہ نہیں توڑا کیونکہ ان کی شاعری میں احمد فراز، فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری پر رومانوی افکار و خیالات حاوی نظر آتے ہیں۔ کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری میں غم جاناں اور غم دوراں کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں کی ناہمواریاں، درد دل اور انسانیت کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ غزل کے اس فن کے حوالے سے جمیل الدین عالیؔ ایک جگہ کہتے ہیں:

> غزل کا فن اسالیبِ اظہار کے نو بہ نو رنگوں کے ساتھ ہمارے تہذیبی اور تمدنی مزاج کی آئینہ داری کرتا ہوا ہر عہد اور ہر زمانے کی روح کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔(۹)

کلثوم افضل زیدویؔ ایک حساس شاعرہ ہے اس لیے انسانیت کا درد ان کے دل میں موجود ہے، کلثومؔ کی شاعری میں حسن، عشق، درد، محبوب، بے وفائی اور تنہائی وغیرہ جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان میں توازن اور

اعتدال بھی موجود ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں رومانوی جذبہ نظر آتا ہے اور دوسری طرف اگر فکری سطح پر دیکھا جائے تو کلثومؔ افضل زیدوی کی غزلوں میں ہمیں معاشرے کا عکس بھی نظر آتا ہے وہ نہایت باریک بینی سے سب چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہیں اور پھر ان جذبات واحساسات کو کلام کے ذریعے بیان کرتی ہیں۔ کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری میں گداز اور جذبوں کی روانی موجود ہے۔

کلثومؔ افضل زیدوی ایک رومانوی فنکارہ ہے۔ اس لیے رومانیت کا جذبہ ان کی غزلوں میں جابجا نظر آتا ہے، رومانوی شاعر کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف عشق و عاشقی تک محدود ہوتا ہے لیکن رومانوی رجحانات کا تعین عشق سے نہیں شاعر یا منصف کے زاویہ نظر انداز فکر اور پیرایہ اظہار سے بھی ہوتا ہے اور یہی اظہار ہمیں کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری میں نظر آتا ہے جیسے مثال کے طور پر۔

سایہ تھا کہ اِک خواب تھا مہکا ہوا وہ شخص
نیندوں میں گھُل کے آ گیا روٹھا ہوا وہ شخص
جوڑے تھے ہم نے اپنے لیے اس کے
سب اجزاء سِمٹا تو اجنبی بنا بکھرا ہوا وہ شخص (١٠)

سب دشت محبت کے میرے ساتھ جل گئے
میں اپنے گھر میں رہ کے بے امان بہت ہوں
کیسی رفاقتیں تھیں جو بدنام ہو گئیں
میں عہدِ وفا کر کے پشیمان بہت ہوں (١١)

کلثومؔ افضل زیدوی کی غزلوں میں رومانیت کے جتنے بھی عناصر مثلاً جذبات، تصور دردوغم، انفرادیت، عنائیت، تخیل، فطرت پرستی، ہیت میں تبدیلی اور بیان میں تکرار وغیرہ یہ سب موضوعات جابجا نظر آتے ہیں، جیسے وہ خود کہتی ہے:

ڈھونڈا تھا جِسے ہم نے کُنجہائے جہاں میں
بس یونہی آج مل گیا بچھڑا ہوا وہ شخص (١٢)

کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری میں حسن و عشق کے مضامین جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ رومانوی شعرا کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ وہ صرف عشق و عاشقی تک محدود ہوتے ہیں۔ لیکن رومانوی رجحانات کا تعلق صرف عشق سے نہیں بلکہ شاعر یا مصنف کے زوایہ نظر، انداز فکر اور پیرائے اظہار سے ہوتا ہے۔ ان شعرا کے ہاں عشق کے لازوال تذکرے اور محبوب کی جدائی و بے وفائی اور محبوب کے ہجر و وصال کا بیان موجود ہوتا ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی کے ہاں بھی یہ سارے رنگ و انداز نظر آتے ہیں۔

دوریاں، رنجشیں، جفا کا عذاب میں کبھی اتنا پریشان نہ تھا
ذرہ ذرہ بکھر گئی مری ذات میرا دل یوں کبھی ویران نہ تھا(۱۳)

کلثومؔ افضل زیدوی غزل کے مزاج اور لوازمات سے بخوبی واقف ہیں۔ اور وہ اپنے خیالات واحساسات کو نہایت عمدگی سے بیان کر دیتی ہیں جبکہ غزل کے اس فن کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ:

غزل گوئی بڑی مشکل چیز ہے۔ نئے نئے خیالات کو نئے نئے انداز سے صرف دو مصرعوں میں سمو دینا بلاشبہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا مصداق ہے۔(۱۴)

کلثومؔ افضل زیدوی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی صنف میں جدت اور ندرت پیدا کی ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی اپنے محبوب کے حسن سے متاثر نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں حُسن فطرت کی واردات کا اظہار بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ کیا ہے۔

کلثومؔ افضل زیدوی نے جہاں پر اپنی شاعری میں عشق و محبت کی باتیں کی ہیں۔ اور رومانیت کے مضامین کو بھی بیان کیا ہے۔ وہاں پر عصرِ حاضر کے حالات سے بھی چشم پوشی نہیں کی، کلثومؔ افضل زیدوی کو زندگی میں جن تجربات سے دوچار ہونا پڑا انہی تجربات نے انہیں گہرا شعور اور ادراک بخشا ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی نے خیالات اور افکار کے پل نہیں باندھے جو کہ صرف خوابوں کی دنیا میں ہی اچھے لگتے ہیں، بلکہ معاشرے کے مسائل کو دیکھ کر اپنی شاعری میں اُن کو واضح طور پر بیان کیا ہے کلثومؔ افضل زیدوی کے ہاں زندگی اور روزمرہ کے مسائل کا عکس باآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

کاندھے پہ رکھو خود کا، زمانے کا بوجھ بھی
لوگوں کے سہارے تو سہارے نہیں ہوتے(۱۵)

کلثومؔ افضل زیدوی ایک حساس طبیعت کی حامل شاعرہ ہے۔اور اسی حساس طبیعت کی وجہ سے انھوں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لے کر پھر اس کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔اور ان کی غزلوں میں لطیف جذبوں کا احساس بھی نمایاں ہے ان کی غزلوں میں احساسات، جذبات اور جدیدیت بھی ہے اور رومانوی فضا بھی چھائی ہوئی ہے، جس کا اظہار وہ ایک غزل میں یوں کرتی ہیں:

یقین کرلو اعتبار اپنے پاس رکھو نگاہِ ناز کا دستار اپنے پاس رکھو
میں بھی بیچوں گا کسی دِن وفا کے یہ دل نگاہِ یار خریدار اپنے پاس رکھو(۱۶)

کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری میں وہ تمام موضوعات شامل ہیں۔جو انسان کو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں، کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری متنوع موضوعات کی شاعری ہے۔

ہم تو ڈھونڈیں گے خوشی کے لمحے
سر سے غم کی بلا ٹلے نہ ٹلے
زندگی مصلحت کی بھینٹ چڑھی
کیا خبر اب بھی ہم بھلے نہ بھلے(۱۷)

کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری میں احمد فراز اور فیض احمد فیض کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔بہت سے شعرا وادیب نے مستند شعرا کی شاعری سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرتے ہوئے ان کے اثرات قبول کرتے ہوئے ان کی تقلید پر چلنے کی کوشش کی ہے۔کلثومؔ افضل زیدوی نے بھی فیض اور احمد فراز کا اثر قبول کیا جس کی واضح مثالیں ان کی شاعری میں جابجا ملتی ہیں۔ان کی شاعری میں لمبی بحر والی غزلوں کا آہنگ و طرز فیض کے آہنگ کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں، جیسے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کچھ کر نہ سکے مجبوری تھی لاچار محبت پر اپنی
اِس دل کے لہو کو چھڑکا کر آنکھوں کا نگر نمناک کیا کلثومؔ
سرابوں سے دھوکہ، ہر گام ملا تو پھر سوچا جب وہ ہی نہیں
مسجود مرا کیوں میں نے جبیں کو خاک کیا؟(۱۸)

کلثومؔ افضل زیدوی کو زندگی میں جن تجربات سے دوچار ہونا پڑا وہاں ان تجربات نے انہیں گہرا شعور اور ادراک بھی بخشا ہے، ان کی غزل میں موضوعات زندگی آمیز بھی ہیں اور حیات آمیز بھی ہیں اور ایک جگہ فراز احمد فراز کا رنگ بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے، جس طرح وہ ایک غزل میں کہتی ہیں:

تجھ کو گلہ ہے میری سنگ دلی کا آؤ تو یہ پتھر کا جگر پاش پاش کر خاموش ہے
صدیوں سے یہ سینے کا سمندر پتھر ہی کوئی پھینک سطح مرتعاش کر (۱۹)

کلثوم افضل زیدوی نے اردو شاعری میں غزل کی صنف کے ساتھ ساتھ اُردو نظمیں بھی پیش کی ہیں ہے نظم ایسی صنف ہے جس میں شاعر اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نظم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

نظم بنیادی طور پر تاثرات کے تجزیاتی مطالعے کا ایک وسیلہ ہے اور اس خاص میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں۔ (۲۰)

بقول پروفیسر احتشام حسین:

نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جن کا کوئی حسین موضوع ہو اور جن میں فلسفیانہ، بیانیہ یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور کچھ داخلی دونوں قسم کے اثرات پیش کیے ہوں۔ (۲۱)

جدید دور میں نظم نگاری کے حوالے سے اہم نام کلثومؔ افضل زیدوی کا بھی ہے۔ کلثوم افضل زیدوی بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعرہ ہیں۔ لیکن انھوں نے غزل سے ہٹ کر اپنی شاعری میں نظم کا اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، نظم کا لہجہ اور اسلوب ان کی آزاد نظموں میں موجود ہے۔ کلثومؔ افضل زیدی کا لہجہ، اسلوب، لفظیات، اسالیب وغیرہ کی انفرادیت ان کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی کی نظمیں اعلیٰ ذہنی سطح کے قاری اور عام قاری کی فہم و سمجھ میں جلدی آتی ہیں، ان کے جذبات میں انفرادیت اور اجتماعی رنگ کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ کلثومؔ افضل زیدوی جہاں بھی فن کا مظاہرہ کرتی ہے تو کلام میں ایک کشش سی پیدا ہوتی ہے آپ کی نظموں کی فکری خصوصیات میں رومانوی پہلو پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی رومانوی جذبہ نظر آتا ہے۔ اور یہ فضا ان کی نظموں میں بھی چھائی ہوئی نظر آتی ہے، انہوں نے تمام موضوعات اور مضامین کو نظم میں سمونے کی خوبصورت کوشش کی ہے، جس میں مثلاً جذبات، انفرادیت، تصور درد و غم، ماضی پرستی، فطرت پرستی، تخیل جیسے

موضوعات کو خوبصورت انداز سے شاعری میں برتا ہے۔کلثوم افضل زیدوی کی مجموعہ "سنگتارے" میں شامل نظموں" میں تنہاہوں" ناامیدی، تیرا احسان، میں رومانوی فضا نظر آتی ہے۔

شام بھیگی تو مجھے یاد آیا وہ زمانہ تری محبت کا جب ستاروں کے دیپ جلتے تھے
ہم ترے ساتھ ساتھ چلتے تھے کبھی دریا پہ کبھی پنگھٹ پہ خواہشوں کے چراغ جلتے تھے
اب نہ دل ہے نہ تیری چاہت ہے نہ دیئے ہیں نہ مسکراہٹ ہے(۲۲)

ایک اور نظم" تیرا احسان" میں کلثومؔ افضل زیدوی محبوب سے گلے شکوے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں:

زندگی کیطرح آرزو ختم ہے
جزُتری آنکھ کے ہر نظر زخم ہے
تو بھی دِل سے اگر مڑ کے جانے لگے
کیا نظاروں سے نظریں ملاؤ نگا میں(۲۳)

کلثومؔ افضل زیدوی نے زندگی کی ناپائیداری کا ذکر بھی کیا ہے۔کہ یہ کس طرح کی زندگی ہے کہ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔کیونکہ کلثومؔ افضل زیدوی ایک حساس طبیعت کی شاعرہ ہے،اور انھوں نے ہر اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے جو اس نے دیکھ کر محسوس کیا ہے۔زندگی کے حوالے سے میں کلثومؔ افضل زیدوی اپنی نظم" کیا یہی زندگی ہے؟میں لکھتی ہے:۔

بے داد صدا جائے مایوس پلٹ آئے
افلاک کی ویرانی آنکھوں میں سمٹ آئے
بے درد اُجالوں میں راتوں کی تیرگی کیا یہ ہی زندگی ہے؟(۲۴)

کلثومؔ افضل زیدوی نے عصری و معاشرتی و سماجی موضوعات کو اپنی نظموں میں شامل کیا ہے۔انہوں نے زیادہ تر اپنے ارد گرد پھیلے موضوع اپنی نظم میں پیش کیے ہیں۔ہے،جیسے اس کی ایک نظم ہے۔" نیا سال":

نئی صدی ہے نئے سال کی مُسافت ہے
چلو کہ دور کریں دِل میں جو کثافت ہے
میں حرف حرف کی ترتیب ترے نام کروں
تُو میرے نام کرے جو تری نزاکت ہے

جو سنگ میل محبت میں پچھلے سال ڈلے
اُسی اساس پہ تعمیر اب عمارت ہے(۲۵)

کلثوم افضل زیدوی نے زندگی کے حوالے سے بہت سی نظمیں تحریر کیں ہیں، کیونکہ زندگی کے بارے میں ان کا مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے، وہ اپنے طور پر زندگی اور معاشرے کا گہرائی سے مطالعہ کرتی ہیں۔ نظم "بے یقینی" میں وہ لکھتی ہے کہ:

آؤ کہ میں تمہیں دھڑکنوں کی تہوں میں لپیٹ دوں
کیونکہ زندگی کے گلزاروں میں خوشیوں کے سائے
مٹنے والے ہیں اور بے یقینی اور خوف کی کڑی دھوپ
پھیلنے والی ہے تُو موسمی پھول ہے بہار کا(۲٦)

کلثوم افضل زیدوی نے اپنی نظموں میں دیہات کی عکاسی بھی کی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں دیہاتی زندگی وہاں کے حالات وواقعات کی تصویر کشی خوبصورتی سے کی ہے:

اِک گاؤں کے چھوٹے پنگھٹ پر اک الہڑ سی دوشیزہ کا آنا جانا
ہرنوں جیسا ہے فصل سنہری خوشوں کا اور رنگت اس کی گندم جیسی
وہ ساتھ صبح کے آتی ہے اور سورج لے کر پہلو میں پھر شام کو وہ ڈھل جاتی ہے(۲۷)

کلثوم افضل زیدوی نے اپنی نظموں میں مناظر فطرت کی عکاسی بھرپور طریقے سے کرتے ہوئے فطرت کے حسن کو اپنی نظموں میں سمو دیا ہے۔ نظم "تلاش" میں بہار، پھول، رنگ، میلے، دنیا وغیرہ کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ جیسے مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

احساس کی دھڑکن میں خوشبوؤں کے آنگن میں
پھولوں کی مہکار میں رنگوں کی بہار میں(۲۸)

کلثوم افضل زیدوی نے آزاد نظم پر بھی طبع آزمائی کرتے ہوئے بہت سی نظمیں پیش کی ہیں۔ آزاد نظم کے حوالے سے پروفیسر انوار جمال لکھتے ہیں:

یہ شعری اصطلاح ہے اور نظم کی قسم ہے۔ ردیف، قافیہ اور پورے یونٹ (Unit) کے لیے ایک "بحر کی پابندی سے آزاد شاعری کو" نظم آزاد کہتے ہیں۔ نظم آزاد کے ہر مصرعے (Line) کی بحر اور وزن ہوتا ہے۔(۲۹)

کلثوم افضل زیدوی کی ایک نظم " انتظار" اہم ہے جو کہ آزاد نظم کی مثال ہے۔

تم مہینوں کے بات کرتے ہو ہم نے لمحوں میں تجھے ڈھونڈ لیا اپنی دانست میں تم چھوڑ گئے مجھ کو فرقت کے حوالے کر کے میں یہ عمر عزیز چھوڑ گیا تری یادوں کے سہارے کر کے (۳۰)

ایک اور نظم میں وہ کہتی ہے کہ:

تیرا میرا رشتہ جیسے
رات اور شام کا ملنا ہے
رات کا آنچل پھیل گیا تو شام سلونی ڈوب گئی (۳۱)

نظم "سراب" بھی آزاد نظم کی ایک خوبصورت مثال ہے جس میں کلثوم افضل زیدوی نے اپنے احساسات، خیالات اور جذبات کا اظہار دلنشین انداز میں کیا ہے، اس میں کلثوم افضل زیدوی کے جذبات مکمل آہنگ کے ساتھ موجود ہیں۔ اور جذبے کی شدت بھی موجود ہے۔

کلثوم افضل زیدوی نے اپنے مجموعے میں پابند نظمیں بھی پیش کی ہیں، اس حوالے سے ان کی نظم " آزمائش" اہم ہے۔

گہرے دریا میں اُتر کر دیکھو خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھو
نیند آئے گی آنکھ بھر کے تمہیں ہم کو پلکوں میں چُھپا کر دیکھو (۳۲)

کلثوم افضل زیدوی نے آزاد نظم اور پابند نظم کے ساتھ ساتھ ترکیب بند نظم پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ترکیب بند نظم میں ٹیپ کا مصرعہ بار بار آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

> ترکیب بند میں اشعار غزل کی مانند قافیہ اور ردیف کے حامل ہوتے ہیں مگر پانچ تا گیارہ اشعار کے بعد ایک ایسا شعر لایا جاتا ہے جو اسی بحر میں ہوتا ہے مگر قافیہ اور ردیف تبدیل ہو جاتی ہے۔ (۳۳)

اس حوالے سے کلثوم افضل زیدوی کی نظم " ڈھلتی عمر" اہم ہے۔

ترے بالوں میں چمکتی رہے چاندی کی کرن
ترے چہرے سے جوانی کی دھوپ ڈھل جائے
ناتوانی سے لرزنے لگیں بانہوں کے

کماں ضعفِ عمری سے لچکتی یہ کمر بل کھائے
ترا ہر روپ نگاہوں میں ہم چُھپالیں گے
ہم تو ہر رنگ میں اے دوست تجھے چاہیں گے (۳۴)

کلثوم افضل زیدوی نے اپنے شعری مجموعہ "سنگتارے" میں اور اصناف سخن کے ساتھ ساتھ قطعہ کی صنف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ قطعہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس میں شاعر اپنے جذبات کا اظہار نہایت اختصار کے ساتھ کرتا ہے۔ قطعہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی ٹکڑا کے ہیں۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مطابق:

> قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں یہ ایک صنف شعر ہے جس میں قوانی کی ترتیب قصیدے یا غزل کے مطابق ہوتی ہے۔ یعنی تمام اشعار کے مصرعہ ہائے ثانی ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن غزل اور قصیدے کے برعکس قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا اور مقطع ضروری نہیں ہوتا قطعہ کے لیے کم سے کم دو شعروں کا ہونا ضروری ہے۔ زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں۔ (۳۵)

کلثوم افضل زیدوی کے قطعات سادگی اور انداز بیاں کی وجہ سے اہم ہیں، وہ قطعات میں نہ صرف اپنی ذات کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اپنے اندر کے کرب کو قطعات کی صورت میں بیان کرتی ہیں کلثوم افضل زیدوی کے قطعات کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

بھاگ کے دشت کے گوشے میں چُھپا ہوں
یارو مجھ سے دنیا سے نہ لڑنے کا گلہ مت کرنا
راستہ میرا جُدا ہے تیری منزل ہے
جُدا راہ میں مجھ سے بچھڑنے کا گلہ مت کرنا (۳۶)
ہم سرِ شام تری یاد کے تہہ خانے میں
تری خاموش نگاہوں سے پیار کرتے ہیں
ڈھونڈتے ہیں تری قدموں میں منزلوں کا
سراغ کشید تیری نگاہوں سے پیار کرتے ہیں (۳۷)

کلثوم افضل زیدوی نے غزل اور نظم کے علاوہ رباعی کی صنف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔رباعی کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ غزل اور نظم دونوں کا مزاج رکھتی ہے۔اور دونوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ رباعی کے حوالے سے محمد ارشاد لکھتے ہیں:

رباعی صورت کے لحاظ سے مختصر ترین غزل ہے اور سیرت کے اعتبار سے مختصر ترین نظم۔(۳۸)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری رباعی کی تعریف یوں کرتے ہیں:

رباعی اس صنف سخن کا نام ہے جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال ادا کیا جاتا ہے ، گویا رباعی اُردو کی وہ مختصر ترین صنفِ سخن ہے جس میں مقررہ اوزان، وحدتِ خیال اور تسلسلِ بیان کی پابندی از بس ضروری ہے۔(۳۹)

کلثومؔ افضل زیدوی کے ہاں رباعیات میں رومانوی انداز اور فطرت پرستی کا ذکر ملتا ہے، غزلوں کے علاوہ رباعیات میں بھی کلثومؔ افضل زیدوی نے محبوب کے موضوع کو مد نظر رکھا ہے۔اس حوالے سے ایک اہم رباعی ملاحظہ ہو۔

کرتے رہے ہم درد کا بیوپار مدتوں ہارے
بھی جیتے رہے بے کار مدتوں آنکھوں کو نم دیا
کبھی جینے کو غم دیا یوں ہم سے جتاتے رہے وہ پیار مدتوں(۴۰)

کلثومؔ افضل زیدوی نے اپنے شعری مجموعہ "سنگتارے" میں ایسے شعر بھی تحریر کیے ہیں۔جو فردیات کے حوالے سے مشہور ہیں، وہ کہتی ہے۔

وفا ہم پر بھی کیا لازم ہے لوگو محبت اس کی جب محکم نہیں ہے۔ (۴۱)

کلثوم افضل زیدوی نے شعری مجموعہ "سنگتارے" میں ہائیکو کو بھی شامل کیا ہے۔ہائیکو جاپانی صنفِ شاعری ہے۔ہائیکو کے حوالے سے خاور اعجاز کہتے ہیں:

ہائیکو کا ایک وصف پہلے دو اور تیسرے مصرعے کے درمیان سوچ کے لیے ایک ایسا خلا چھوڑ دینا ہے جسے قاری اپنی استطاعتِ فکر اور وسعتِ خیال سے خود پُر کرتا ہے۔ (۴۲)

قرۃ العین طاہرہ کے مطابق:

ہائیکو مظاہرِ فطرت کی باریکیوں کا بیان ہے۔(۴۳)

کلثوم افضل زیدوی کے اس شعری مجموعے میں ہائیکو کی مثالیں بھی جابجا نظر آتی ہیں۔

پہلی بارش اس موسم کی پہلی بارش تب برسی
جب میری آنکھوں کے سوتے بہتے بہتے خُشک ہوئے (۴۴)

کلثوم افضل زیدوی کی شاعری کا انداز بیان واسلوب سادہ رواں اور سلیس ہے۔کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری کے حوالے سے عظمی قمر کہتی ہیں:

جہاں تک کلثومؔ کی شاعری میں فنی تکنیک کا سوال ہے تو اُن کا اسلوب نہایت سادہ اور برجستہ ہے اُن کی شاعری میں گنجلک الفاظ کی پیچیدگی یا تصنع اور بناوٹ کہیں بھی نظر نہیں آتے۔وہ نہایت سہولت اور روانی سے دل کی بات کہتی ہیں۔ (۴۵)

کلثومؔ افضل زیدوی کی شاعری میں فکر کا حسین امتزاج ہمیں نظر آتا ہے۔ان کے ہاں ہمیں رومانوی جذبہ نظر آتا ہے، لیکن اگر فکری سطح پر دیکھا جائے تو کلثومؔ افضل زیدوی کی غزلوں میں ہمیں معاشرے کا عکس نظر آتا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ بجنوری، مشمولہ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی کراچی، ۲۰۱۳ء، ص:۴۲۵
۲۔ ناصر علی سید، سنگتارے، از کلثوم افضل زیدوی، عکس پبلی کیشنز پشاور، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص:۳
۳۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، عکس پبلی کیشنز پشاور، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص:۱۱۳
۴۔ ایضاً، ص:۱۵
۵۔ اعظمی قمر، سنگتارے، از کلثوم افضل زیدوی، ایضاً، ص:۱۴
٦۔ ناصر علی سید، سنگتارے، از کلثوم افضل زیدوی، ایضاً، ص:۳
۷۔ جمیل الدین عالیؔ، اُردو غزل چند مسائل، مشمولہ سرسیدین جلد پنجم، ص۸۸٦
۸۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء، ص۳۱
۹۔ جمیل الدین عالیؔ، اُردو غزل چند مسائل، مشمولہ سرسیدین جلد پنجم، ص۸۸۷
۱۰۔ کلثومؔ افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً، ص:۲۹

۱۱۔ ایضاً ،ص:۲۹

۱۲۔ ایضاً،ص:۲۹

۱۳۔ ایضاً،ص:۳۰

14۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر، تنقیدی زاویے،ص۱۰۷

۱۵۔ ایضاً،ص:۴۱

۱۶۔ ایضاً،ص:۲۰۴

۱۷۔ ایضاً،۲۰۰

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ص:۱۰۱۔۱۰۲

۲۰۔ وزیر آغا،ڈاکٹر، تنقید اور احتساب،ص۳۲

۲۱۔ اختشام حسین، پروفیسر، منقول از کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۱۹۹

۲۲۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً،ص:۲۱

۲۳۔ ایضاً،ص:۹۱

۲۴۔ ایضاً،ص:۹۳

۲۵۔ ایضاً،ص:۹۷

۲۶۔ ایضاً،ص۱۰۵

۲۷۔ ایضاً،ص: ۸۰

۲۸۔ ایضاً،ص۱۸۱

۲۹۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، سن، اکتوبر ۲۰۱۴ء، ص، ۱۷۲

۳۰۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً،ص:۱۲۹

۳۱۔ ایضاً،ص:۱۱۲

۳۲۔ ایضاً،ص:۱۴۶

۳۳۔ سلیم اختر،ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، سن،۲۰۱۱ء، ص،۵۱

۳۴۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً، ص:۵۴

۳۵۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد طبع اول،۱۹۸، ص،۹۵

۳۶۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً، ص:۳۰

۳۷۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً، ص:۴۴

۳۸۔ محمد ارشاد، تحقیق و تنقید، ص۶۹

۳۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو رباعی، ص۱۴۸

۴۰۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً، ص:۴۳

۴۱۔ ایضاً، ص:۴۷

۴۲۔ خاور اعجاز، اردو ہائیکو کی شناخت، مشمولہ اوراق، ص۴۱ ۳۷۔

۴۳۔ قرۃ العین حیدر، ہائیکو کی ایک نئی صنف سخن، مشمولہ اوراق، ص۴۸

۴۴۔ کلثوم افضل زیدوی، سنگتارے، ایضاً، ص ۶۲

۴۵۔ اعظمی قمر، سنگتارے از کلثوم افضل زیدوی، ایضاً، ص:۱۰

محمد ناصر آفریدی
اسکالر پی ایچ ڈی اُردو، سرحد یونی ورسٹی آف سائنس و ٹیکنالوجی، پشاور
انجم یوسف
اسکالر پی ایچ ڈی اُردو، قرطبہ یونیورسٹی، پشاور

# ڈاکٹر ارشاد شاکر آعوان کی نظموں کا موضوعاتی مطالعہ

## Thematic Study of the Poems of Dr.Irshad Shakir Awan

Irshad Shakir is one of well known name in KPK Hazara Division. He tries his best in both the generals of poetry, poems and ode, but his poems become his recognition. Many collections of his poems have been published in which we find variety of thoughts and topics. Particularly his poems related to 'Iqbal's recognition' are very famous. This article presents different thoughts and artistic sides of Irshad Shakir's poems.

**Keywords:** *Intellectual thought, Progressive Perception, Iqbal, Leaders of Muslim Umah, Freedom of expression, Patriotism, Palestinian persecution, Democracy.*

ادب میں شاعری کو مرکزیت حاصل ہے اردو شاعری اردو زبان کے معرضِ وجود میں آنے کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھی۔ جو مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی جدیدیت سے ہمکنار ہوئی۔ اردو شاعری کی دو اصناف غزل اور نظم نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ جابر علی سید اس حوالے سے کہتے ہیں کہ "غزل تہذیب کی شاعری ہے اور نظم شاعری کی تہذیب ہے۔"(۱)

نظم ایسی صنف ہے جس میں شاعر کھل کر اپنے مافی الضمیر بیان کرتا ہے۔ نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لیے استعمال ہو تو اس سے وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جن کا کوئی حسین موضوع ہو اور جن میں فلسفیانہ، بیانیہ یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی و داخلی قسم کے تاثرات پیش کیے ہوں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> نظم بنیادی طور پر تاثرات کے تجزیاتی مطالعے کا ایک وسیلہ ہے اور اس میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں۔(۲)

شعری اصناف میں نظم کی صنف انیسویں صدی کے آخری دہوں میں متشکل ہوتی ہے۔ اقبالؔ اور پھر اقبالؔ کے بعد ترقی پسند تحریک کے ذریعے اس کے خدوخال متعین ہوئے ہیں۔ اردو اصناف سخن میں نظم نسبتاً اور

طویل نظم خصوصاً ایک جدید صنف ہے۔ نظم شاعر کے داخلی جذبات پر ایک کیمیائی تغیر کا کام کرتی ہے۔یعنی وہ انہیں تحلیل کر کے ان سے ایک نیا مرکب تیار کرتا ہے۔بقول عمران ازفر:

> نظم ایک اکائی اور ایک کلی وحدت ہوتی ہے جس کے ذریعے شاعر اپنے خیال کی ایک مرکب تصویر قاری یا سامع تک پہنچاتا ہے۔ نظم اپنے اجزا کے لحاظ سے ابتدا، وسط اور انتہا یا انجام کے ارکان کا حاصل ہوتی ہے لیکن ایک کُل کی صورت میں وہ ایک وحدت ہی ہے۔ جس میں کسی شاعرانہ فکر یا خیال کو شاعرانہ انداز کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ (۳)

خیبر پختونخواہ میں ہزارہ کے شعری منظرنامے کو مدِ نظر رکھیں تو سینکڑوں شعرا سُخن طرازیوں میں مصروف نظر آئیں گے۔ جدید شعرائے ہزارہ میں ڈاکٹر ارشاد شاکرؔ اعوان اپنے منفرد اندازِ شاعری کی بنیاد پر جُداگانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ارشاد شاکرؔ اعوان کی نظموں کے موضوعاتی تنوّع اور بُوقلمونی نے ان کے طرزِ شاعری کو انفرادیت بخشی ہے۔ ارشاد شاکرؔ نے نظم کی تقریباً تمام اقسام پر طبع آزمائی کی ہے۔ان کی نظموں میں جذبے کی فراوانی موجود ہے جو شاعری کے لیے نہایت ضروری امر ہے کیونکہ بقول عمران ازفر:

> اچھا شعر ہمیشہ جذبے اور شعور کے تخلیقی امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔ (۴)

ڈاکٹر ارشاد شاکرؔ اعوان کی نظم نگاری کے فن کو اگر موضوعات کے انتخاب اور الفاظ کے چناؤ کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی انفرادی پہچان ٹھوس مثال بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ارشاد شاکرؔ کی شاعری کے موضوعات کا جائزہ خاصا وسیع ہے ان کا کلام سادہ اور پر تاثیر ہے ان کی نظموں میں موضوعات کا تنوع ورنگینی ملتی ہے۔ارشاد شاکرؔ جدید دور کے شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں نظم وغزل دونوں اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن آپ ایک کہنہ مشق نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں لطافت، پاکیزگی، سبک پروری، اور ندرت خاص طور قاری کے ذوق سلیم کو متاثر کرتی ہے۔بقول قاری غلام رسول تانف:

> ارشاد شاکر کی شاعری کلاسکیت اور جدت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے ان کی شاعری عصری معنویت کی حامل ہے۔ غزل اور نظم پر انہیں شاعرانہ قدرت حاصل ہے۔ (۵)

ارشاد شاکر نے نظم میں معاشرتی حالات کی عکاسی خوبصورت انداز میں کی ہے جیسے نظموں کی سطور چمکتی ہوئی جھالروں میں موتیوں کی لڑیوں کی طرح نظر کو خیرہ کرتی ہیں۔ارشاد شاکر کا شمار دور جدید کے ان شعرا میں ہوتا ہے جن کی نظمیں انفرادیت کی حامل ہیں اور جو موجودہ دور کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر اپنے فن سے انصاف کر

رہے ہیں۔ قدرت نے اُنھیں بہترین تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ کا شعری سرمایہ کم و بیش ایک ہزار صفحات پر محیط ہے، جو انواع و اقسام کی پھُل پھلواریوں سے آراستہ ہے۔ ارشاد شاکرؔ اعوان نہ صرف اُردو کے شاعر ہیں، بلکہ آپ نے دیگر زبانوں میں بھی قابلِ قدر شاعری کی ہے۔ آپ اُردو، فارسی، ہندکو اور پشتو زبان میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ اِن زبانوں میں ان کا قابلِ قدر شعری سرمایہ موجود ہے۔

ارشاد شاکرؔ اعوان کی نظمیں داخلی و خارجی کیفیات کے امتزاج سے متشکل ہوتی ہیں۔ آپ معاشرتی، اخلاقی اور سماجی برائیوں اور بدعنوانیوں کے سَدِّباب کے لیے دینِ اسلام کے سنہری اُصولوں کی ترویج کو ناگُزیر تصوّر کرتے ہیں۔ اِن کے خیال میں ظُلم و ناانصافی کی تاریکیوں کو نورِ اسلام ہی سے مِٹایا جا سکتا ہے۔ ارشاد شاکر اعوان کے اب تک نظموں کے تین مجموعے پیراہنِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں، جن کے اشاعتی کوائف کی تفصیل کچھ یوں ہے:

١۔　شاخ در شاخ　　قرطاس، فیصل آباد، ١٧ مئی ٢٠١٥ء
٢۔　خواب خیال اُجالا　　قرطاس، فیصل آباد، ٢٠ مئی ٢٠١٥ء
٣۔　احوال　　قرطاس، فیصل آباد، ٢٧ء جون ٢٠١٥ء

ارشاد شاکر اعوان کی نظموں کے تین مجموعوں کے عمیق مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کی جُملہ نظمیں فکر و خیال کے اعتبار سے علویّت کی حامل ہیں۔ قرآن و حدیث سے گہری وابستگی، فکرِ اقبال کی غوطہ خوری و رمز شناسی، عربی فارسی اور اردو کے پچاس سالہ وسیع مطالعے نے آپ کے قلب و نظر کے در وا کیے ہیں، جن کے اثرات آپ کی شعری و نثری تحریروں میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ارشاد شاکر اعوان نے فنِ شعر گوئی کو اپنے داخلی احساسات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اُنھوں نے اپنے افکارِ عالیہ کی ترجمانی کے لیے کئی اصناف اور ہیئتوں کو کامیابی سے برتا ہے۔ آزاد، پابند اور معریٰ نظمیں بھی اُن کے ہاں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ قطعات اور رُباعیات سے بھی آپ کا کلام خالی نہیں ہے۔ اُنھوں نے قدیم اور روایتی شعری ہیئتوں میں معنی خیز اور حیرت افزا تبدیلیاں بھی کی ہیں، جو آپ کی اجتہادی فکر کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

ارشاد شاکر اعوان متنوّع و ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، مگر آپ کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں اور ہمہ جہتی کو آپ کی اقبال شناسی نے پردۂ اخفا میں رکھا ہوا ہے۔ اگرچہ "بیانِ اقبال: نیا تناظر" آپ کی اقبال شناسی کا اساسی حوالہ سمجھی جاتی ہے، لیکن "ہِمالہ سے نیا شوالہ تک" اور "جاوید نامہ: حواشی و تعلیقات: بھی اقبالیاتی ادب و سرمائے

میں معنی خیز اور قابلِ قدر اضافے ہیں ۔ اقبال سے متعلق آپ کے افکار نصف صدی کی محنتِ شاقہ، وسیع مطالعے، تفہیمِ قرآن اور تدبّر و تفکّر کا نچوڑ ہیں۔ آپ نے کلامِ اقبال کی فِکری جِہات کی ایسی منفرد تعبیرات کی ہیں، جو واقعی دیدنی ہیں۔ آپ قرآنِ مجید کو فِکرِ اقبال کا اساسی مرکز و محور سمجھتے ہیں۔

ارشاد شاکر اعوان کثیر الجہات تخلیق کار اور ترقّی پسندانہ فکر و احساس کے مالک ہیں۔ آپ محنت کی عظمت اور جہدِ مسلسل پر قوی یقین رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی آج جس مقام و مرتبے پر فائز ہیں، جُہدِ مسلسل اور کاوشِ پیہم کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نظموں میں بھی محنت کی عظمت کا درس و پیغام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اِس خصوص میں اُن کی نظم "دھوپ چڑھی دیوار سے" خاص توجہ کی حامل ہے۔ ارشاد شاکر اعوان کے نزدیک زندگی حرکت کا دوسرا نام ہے اور انسانی بقا و فنا اِسی حرکتِ مسلسل سے وابستہ ہے۔ مذکورہ نظم میں اُنھوں نے اپنی قلبی کیفیات اور داخلی جذبات و احساسات کا اظہار نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی سے کیا ہے۔ اس نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ٹِک ٹِک اِس گھڑیال کی، جس کو دل کہتے ہیں
خون میں گرمی رہنے تک ہے
سایوں نے پیڑوں کے پاؤں پکڑ لیے ہیں
دھُوپ چڑھی دیوار سے تو سائے اُتریں گے
آنے والی رات کو روشن کر نہ سکیں گے
دیپ اشکوں کے
جاگتی آنکھیں
دِل گھڑیال کی تال پہ رقصاں
خون کے شُعلے
زندہ جذبے
ایک الاؤ
ٹِک ٹِک اِس گھڑیال کی، جس کو دِل کہتے ہیں
خون میں گرمی رہنے تک ہے (٦)

ارشاد شاکر اعوان کی نظم میں جدت طرازی کے نئے تجربات ملتے ہیں۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں اور عوامی زندگی سے موضوعات کشید کرتے ہیں اور اُنھیں انتہائی خوب صورتی، فنی مہارت اور استادانہ قادرالکلامی سے نذرِ شعر کرتے ہیں۔ موضوعاتی حوالے سے آپ کی نظموں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ارشاد شاکر اعوان نے مدّحتِ رسول ﷺ، حمدِ باری تعالیٰ، اکابرینِ امّتِ مسلمہ، قومی راہ نماؤں، سیاسی لیڈروں، دوستوں، عزیزوں، وفات یافتوں اور قومی و ملی مسائل پر نہایت فکر انگیز و خیال افروز نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر نذر عابد یوں کہتے ہیں:

> غزل، نظم اور نعت یکساں مہارت سے کہتے ہیں ان کی شاعری میں معاصر منظر نامہ، بھرپور سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ زبان و بیان کی پختگی اور استادانہ رنگ اس پر مستزاد ہے۔(٧)

جذبہ حُب الوطنی ارشاد شاکر اعوان کے خون ورگ وپے میں سرائیت کیے ہوئے ہے۔ اُنھیں نظریہ اسلام کے نام پر وجود پذیر ہونے والی پہلی نظریاتی ریاست سے بے انتہا عقیدت ہے۔ وہ اسلام اور وطنِ عزیز کو تمام وفاداریوں کا مرکز و محور سمجھتے ہیں ارشاد شاکر اعوان ضمیر فروشوں، سوداگروں اور ملک دشمن عناصر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور برملا یہ پیغام دیتے ہیں کہ گلشنِ وطن کی سینچائی، آبیاری، سرسبزی اور شادابی کے لیے خون دینے سے بھی ہم دریغ نہیں کریں گے۔ اُن کی جذبہ حُب الوطنی سے بھرپُور نظم "عہدِ وفا" ملاحظہ ہو:

ہاں! یہ سچ ہے
حضرتِ آدمؑ کی ہیں اولاد ہم
اُن کی بھُول ایک دانہ
جنّتِ جاوید سے حکمِ سفر
داغِ فراق
اے مری خُلدِ بریں، فردوسِ جاں
جانِ بہشت
ارضِ وطن
ہے خطا اپنی سرشت

مانتے ہیں
تُجھ سے لیکن باندھتے ہیں
ہم خدا کے رُوبرُو
چُوم کر تیرے قدم
عہدِ وفا
جب تلک ہے جاں میں جاں، تن میں لہو
آنکھوں میں دم
تُجھ کو رکھیں گے سدا
آباد، شاداب اور ہرا
خون پسینہ دے کے سینچیں گے تُجھے
دانۂ گندم کی خاطر ہم نہ بیچیں گے تُجھ (٨)

ارشاد شاکر اعوان کی نظمیں دردمندی و ہمدردی کے عناصر سے بھرپُور ہیں۔ وہ جب عالمِ اسلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اُمّتِ مسلمہ کے دگرگوں حالات اُن کی روح فرسائی کا باعث بنتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں مسلمانوں کے اخلاقی، علمی سیاسی اور فکری زوال کا اُنھیں بہت دُکھ ہے اور جب وہ اِس داخلی کرب کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں تو قارئین ان کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ اشعار اُن کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ارشاد شاکر کی نظمیں مزاحمتی ادب میں قومی و بین الاقوامی سطح پر ہونے والی سازشوں و سفاکیت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ پروفیسر اسماعیل گوہر اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ان نظموں میں اس عہد کی پوری سیاسی تاریخ سانسیں لے رہی ہے سبھی جمہوری اور غیر جمہوری کرداروں اور رویوں کو متحرک اور جاندار پیکروں میں پیش کیا گیا ہے۔ ۔۔۔ جہاں جمہوری قدروں کو پامال کر کے لوگوں کو غریب عوام اور اسلام کے نام پر شخصی حکمرانی گھٹاٹوپ اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔ (٩)

ارشاد شاکر اعوان مسلمانانِ عالم کے سیاسی حالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ اِس کا ادراک اور گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ اُنھیں ارضِ کابل سے لے کر فلسطین و بیروت تک مسلمانوں پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم کا

بہ خوبی اندازہ ہے۔ آپ مسلمانوں اوراسلام کی سربلندی کے لیے قوّتِ ایمانی و اتحاد بین المسلمین کا درس دیتے ہیں۔ چناں چہ اِس خصوص میں اُن کی نظم "مناجات" ملاحظہ ہو:

ارضِ کابل سے لے کر تابیروت
موجۂ خوں
آبِ رواں سے ارزاں
دشتِ اہواز سے گُردیز کے گلزاروں تک
شہر یاسر سے ابادان کے بازاروں تک
ایک بارود کی بُو، ایک دھُواں
بے حسی حیطۂ ادراک سے باہر ہے
کراں تابہ کراں
سر کہیں، پاؤں کہیں، ہاہیں کہیں
بیٹیاں بیٹے کہیں، مائیں کہیں
بھیج یارب! کسی ایوبیؒ کو
پھر اس بوجھ سے
آزاد کر اِس دھرتی کو
ننگِ اسلاف ہیں
تاریخ کے ماتھے کا سیہ داغ ہیں ہم
رَمقِ ایماں کی رہی کوئی نہیں
تیری رحمت میں کمی کوئی نہیں
حرفِ توحید کا مفہوم سکھادے ہم کو
نسبتِ احمدِ مرسلؐ کا صِلہ دے ہم کو(١٠)

ارشاد شاکر اعوان حُریّتِ فکر کے عَلم بر دار ہیں۔ آپ اظہارِ ذات کو حضرتِ انسان کا بنیادی حق تصوّر کرتے ہیں اور اِس پر لگائی جانے والی قدغنوں کی بھر پُور مذمّت کرتے ہیں۔ اُنھوں نے تاریخِ انسانی کی حق گو، بے باک اور آزادیِ فکر و اظہار کا پیغام دینے والی عظیم ہستیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے تعصّب اور جانب داری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے غیر مُسلم شخصیات کا تذکرہ بھی بڑی فراخ دِلی سے کیا ہے۔ یہ نظمیں محض عظیم القدر دانش وروں، فلسفیوں، راہ نماؤں اور قوم کے اصلاح کاروں کا تذکرہ ہی نہیں، بلکہ اِن کے کردار ی و شخصی اوصاف کی ترجمان بھی ہیں۔ ایسی نظمیں ارشاد شاکر اعوان کی انسانیت پسندی، وسیع المشربی، خرد افروزی اور فِکری بصیرت کا واضح ثبوت ہیں۔ آپ نے سُقراط، اقبال، فیض احمد فیض اور قائدِ عوام ذولفقار علی بھٹو پر اعلیٰ پائے کی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ارشاد شاکر اعوان نے تاریخِ عالم کی ہر اُس شخصیت کو سراہا ہے، جس نے حُریّتِ فکر و آزادیِ اظہارِ خیال کا نعرہ لگایا ہے۔ اس خصوص میں ارشاد شاکر اعوان کی نظم "ایتھنز کا دانا" کا آٹھواں بند ملاحظہ ہو:

پِنڈی کے بَندی خانے میں
اِک صحرائی، تیرا بھائی
تیرا ہم صورت، ہم سیرت
اِس نے بھی وحدت اُجیالی
درس اخوّت کا سکھلایا
وہ بھی تُجھ سا شعلہ خُو تھا
اِس کے ساتھ جوان لہو تھا
اس کے منصف بھی ہم پیشہ
جیسے تھا، فرہاد کا تیشہ
وہ بھی تھا انصاف کا طالب
رحم کی بھیک نہ مانگی اُس نے
درد کی داد کا وہ تھا طالب
ہونا تھا جو، طے پایا تھا

اس نے بھی اِک لفظ کہا تھا
"ختم کرو یہ"(۱۱)

ارشاد شاکر اعوان کی نظموں میں بھٹو سے عقیدت مندی کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے جس کا اصل سبب قائدِ عوام کی عوام دوستی، اسلام پسندی، جمہوریت کی بحالی اور بہترین خارجہ و داخلہ پالیسیاں ہیں۔ اُن کی حُب الوطنی اور اسلام دوستی میں ارشاد شاکر اعوان کے نزدیک کسی قسم کے شک کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ ارشاد شاکر اعوان نے مذکورہ بالا خیالات کا اظہار اپنی نظم "خواب خیال اُجالا" میں یوں کیا ہے:

اپنی دھرتی سے پیار ہے مجھ کو　　خاکِ طیبہ سے دِل لگایا ہے
میں نے ملّت کے سربراہوں کو　　لا کے پھر اِک جگہ بٹھایا ہے
اِس سے بڑھ کر قصور کیا ہو گا　　میں نے وحدت کا گیت چھیڑا ہے
اتحادِ اُمّتِ مسلماں کا　　سب اِسی جُرم کا بکھیڑا ہے
میں مساوات کا ہوں دیوانہ　　کہ یہ میرے نبیؐ کی سنّت ہے
اہلِ ثروت کے پاس ہے جو کچھ　　میرے محنت کشوں کی محنت ہے
میں اِسے بانٹنے کے درپے تھا　　چُوسنا خون ان کی فطرت ہے
یہ جو ہیں سامراج کے پِٹھو　　ہو گئے میری جان کے دشمن
مُجھ کو دیتے ہیں جو بھی یہ الزام　　ان سے بھر پور ان کے ہی دامن
جلد اُتریں گے ان کے چہروں سے　　دین و ایمان کے عارضی روغن(۱۲)

ارشاد شاکر اعوان نے اپنے قلم قبیلے کے دوست احباب کے متعلق بھی بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ اِن نظموں میں آپ نے اپنے رُفقا کی شعری کاوشوں کی خوب داد دی ہے۔ یہ نظمیں آپ کی وسیع النظری و اعلیٰ ظرفی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اِن نظموں میں ارشاد شاکر اعوان نے دوستوں کے شخصی و کرداری اوصاف کو بھی بیان کیا ہے۔ اِس کے پہلو بہ پہلو آپ نے اِن کے کلام پر منظوم تبصرے بھی کیے ہیں۔ اِس حوالے سے بھی آپ کی یہ منظومات اہم تخلیقی دستاویز ہیں۔ آپ اہلِ ہنر ہیں اور اہلِ ہنر کے اعتراف کو اہم فریضہ تصوّر کرتے ہیں۔ آصف ثاقب ارشاد شاکر اعوان کے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں۔ اِن کی یہ رفاقت کم و بیش چالیس سال کے عرصے کو محیط

ہے۔ آپ کے نام آصف ثاقب کے بے شمار خطوط بھی اس دوستی کی گہرائی اور اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ چناں چہ ارشاد شاکر اعوان اپنی نظم "سلطان محمد آصف خان ثاقب" میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

دوستی کا مدھر اظہار ہے آصف ثاقب
ہر حوالے سے طرحدار ہے آصف ثاقب
ہے زبردستوں کے حلقے سے تعلق لیکن
زیردستوں کا طرف دار ہے آصف ثاقب
دشتِ الفت کا وہ سادھو، وہ وفا کا باہوؒ
استقامت کا علم دار ہے آصف ثاقب
دنیوی عیش کی ہر اک چمک رکھتا ہے
باوجود اِس کے بھی دیں دار ہے آصف ثاقب
نہ شکایت، نہ گلہ ہے، نہ تکبّر نہ غرور
ننگ پرور ہے، جہاں دار ہے آصف ثاقب(۱۳)

ارشاد شاکر اعوان کے درج بالا تین شعری مجموعوں میں کل دو سو نظمیں ہیں۔ پچیس شخصی مرثیے ہیں، جو رثائی شاعری کی ذیل میں آتے ہیں۔ بعض نظمیں آپ نے دوست احباب کی فرمائش پر لکھی ہیں۔ انھیں فرمائشی نظمیں کہنا ہی مناسب ہو گا۔ جب کہ بعض نظمیں انھوں نے دوستوں اور عزیزوں کی یاد میں تخلیق کی ہیں، جو یاد نگاری کی ذیل میں آتی ہیں۔ فرمائشی اور دوست احباب کی یاد میں لکھی گئی نظموں سے آپ کی بدیہہ گوئی اور قادرالکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان نظموں میں فیض احمد فیض، نذرِ ثاقب، الوِداع، پرنسپل پروفیسر نذر دین صاحب کے لیے، سلطان محمد آصف خان ثاقب، پروفیسر محمود خان کے لیے، پروفیسر سید مرتضیٰ شاہ شنکیاری، ڈاکٹر ممتاز گیلانی ہومیو ڈاکٹر، حبیبِ مکرم پروفیسر صوفی رشید وغیرہ وغیرہ نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

ارشاد شاکر اعوان کے ہاں شخصی مرثیے بھی تعداد میں کم نہیں ہیں۔ اُنھوں نے اُردو شعر و سُخن کی جُملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ارشاد شاکر اعوان کے ہاں کربلائی مرثیوں کی بجائے شخصی مراثی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ آپ نے اپنے بڑے چچا گُل زمان عاجز بفوی، والدِ محترم، عزیز و اقارب، معتبر علمی و ادبی شخصیتوں، قومی راہ نماؤں اور دوستوں کی وفات پر غم و اندوہ میں ڈوب کر پُر تاثیر شخصی مرثیے کہے ہیں۔ یہ نظمیں نہ صرف رثائی

شاعری کا عمدہ نمونہ ہیں، بلکہ زبان و بیان پر ارشاد شاکر اعوان کی قدرت اور قادرالکلامی کا بیّن ثبوت بھی ہیں۔ ارشاد شاکر اعوان نے ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے تاریخی زلزلے کی تباہ کاریوں اور ہولناک مناظر کی دل دوز لفظی تصویریں صفحۂ قرطاس پر بنائی ہیں، جو دیکھنے والوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ اِس ہوش ربا زلزلے میں ارشاد شاکر اعوان کا ننھیالی خاندان بھی بری طرح متاثر ہوا اور بالاکوٹ میں قیام پذیر آپ کے خاندان کے تقریباً پچاس سے زائد افراد حالتِ روزہ میں جامِ شہادت نوش فرما کر ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ اسِ داخلی اور اجتماعی کرب نے آپ سے ایسی پر تاثیر اور کرب انگیز نظم تخلیق کروائی، جسے ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے شہدائے زلزلہ کا مرثیہ کہا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے زلزلے کے بعد کی صورتِ حال کی ایسی تصویر گری کی ہے کہ وہ مناظر حقیقت بن کر نگاہوں کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ ارشاد شاکر اعوان نے اسِ نظم میں مکانوں کے انہدام سے اٹھنے والے گرد و غبار، عمارتوں کے نیچے دب جانے والوں کی چیخ و پکار، گلاب اور پری تمثال چہروں کے انتقال، بے کفن لاشوں کے انبار، وغیرہ کو حزنیہ لب و لہجہ میں یوں پیش کیا ہے:

کس قدر ہولناک منظر ہے
کچے پکے مکان ڈھیر ہوئے
ایک گرد و غبار
چیخ پکار
کیسے کیسے گلاب چہرے تھے
کیسے کیسے بدن پری تمثال
موت کی نیند سو گئے یک بار
اوڑھ کر اپنے ہی گھروں کا غبار
کوئی نوحہ نہ بین ہے کوئی
بے کفن لاشے ریت کے انبار
شہر کے شہر ہو گئے مسمار
لِمَنِ الملک کی صدا گونجی
مٹ گیا فخرِ جبہ و دستار

دھنس گئے گھر کے ساتھ گھر والے
دب گئے خاک میں درو دیوار
موت کی گھاٹیاں ہوئے بازار۔۔(الخ)(۱۴)

ارشاد شاکر اعوان کی نظموں میں نعتیہ شاعری بھی امتیازی شان لیے ہوئے ہے۔ آپ کا نعتیہ مجموعہ "نعت دریچہ" کے عنوان سے پیراہنِ طباعت سے آراستہ ہو چُکا ہے۔ نعت دراصل حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک سے والہانہ عشق کے اظہار کا نام ہے۔ نعت گوئی کا شرف اُسی شاعر کو حاصل ہو سکتا ہے، جو دولتِ ایمانی اور عشقِ رسول ﷺ سے مالا مال ہو اور جسمانی و روحانی طہارت و پاکیزگی کا عمدہ نمونہ ہو۔ اگرچہ اُن کی نعتوں کا ایک مجموعہ ہے، مگر معیار و اعتبار، نعت کے اُصولوں، فنی نزاکتوں، زبان و بیان کی خوبیوں اور خیالات کی نفاست و لطافت، اُسلوبِ بیان کی نُدرت و تشبیہات کی جّدت کے لحاظ سے یہ اپنی مثال آپ ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ارشاد شاکر اعوان کو بہ حیثیتِ نعت گو شاعر زندہ رہنے کے لیے "نعت دریچہ" کے علاوہ کسی اور حوالے کی ضرورت نہیں ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ آپ فنِ نعت گوئی کے تقاضوں سے کلّی طور پر آگاہ ہیں۔ فنِ نعت گوئی پر آپ کی کتاب "عہدِ رسالت ﷺ میں نعت" حوالے کی شے ہے۔ اِس موضوع پر عربی ادب میں بھی اتنی وقیع کتاب شاید ہی موجود ہو۔ آپ کی نعت کے حوالے سے ڈاکٹر ریاض مجید کہتے ہیں کہ:

ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کا نعتیہ کلام ایک قوس قزح کی مانند ہے جہاں محبتوں اور عقیدتوں کے گوناگوں رنگ افقِ نعت کو مزین کرتے چلے جاتے ہیں۔ صنف نعت میں آپ کے نوتراشیدہ خوبصورت مضامین آپ کی جدت طرازی اور نکتہ آفرینی کے مظہر ہیں۔(۱۵)

ارشاد شاکر اعوان کی نظمیں انتہائی غور و فکر کا تقاضا کرتی ہیں۔ آپ کی بعض نظموں کے عنوانات بھی اپنے اندر جہانِ معنی رکھتے ہیں مثلاً؛ اصحابی کالنّجوم، تارا مسیح، نکتۂ دلپذیر قآنی، والتّین، صلی علی محمد ﷺ، اِتّقو، الدین القیم، اصحاب الشمال، حبّذا اے تارکِ آفلؑ کی جاں، والقدرِ خیرہِ و شرہِ، لیل التّمام، والعصرِ، اور منفی ضرب منفی مساوی جمع وغیرہ۔

ارشاد شاکر اعوان کی نظموں میں موضوع کی رنگینی پائی جاتی ہے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت، تاریخ اور جدید شاعری کا مطالعہ ارشاد شاکر کو اسلامی تاریخ وثقافت اور پاکستان کی نظریاتی بنیاد سے گہری وابستگی عطا کرتا ہے جس پر وہ اپنے تمام تر مشاہدات و تجربات کو کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ سیاست، مذہب، معاشرہ، ثقافت، تاریخ، تقدیر،

جدوجہد غرض کہ ہر موضوع پر ارشاد شاکرؔ کی نظمیں اوجِ کمال پر نظر آتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ذات کے ارد گرد پھیلے ہوئے سماج اور ماحول سے شعری موضوعات اخذ کیے ہیں۔ آپ کے کلام میں ملکی اور بیرونی دنیا تک کے مسائل کا عکس واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں پوری انسانیت کے مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اُن کا ممکن حل بتانے کی مخلصانہ کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری سے متعلق ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں کہ:

> ان کی شاعری کے فکری ماحول میں علاقائی مسائل سے بیرونی دنیا کے آشوب تک سیکڑوں موضوعات و مضامین کا سراغ ملتا ہے۔ (١٦)

ارشاد شاکر اعوان کی شاعری میں سطحیت کی بجائے معنوی تہہ داری، گہرائی، گیرائی اور فکری بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ آپ محض شاعر نہیں ہیں، بلکہ عالم شاعر ہیں۔ آپ کا وسیع مطالعہ اور علمیّت تخلیقِ شعر کے دوران میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ اُنھوں نے قرآنی تلمیحات کو نہایت عمدگی اور اُستادانہ مہارت کے ساتھ اپنے کلام کا حصّہ بنایا ہے۔ ابہام اور پیچیدگی اُن کے کلام میں کہیں روڑے نہیں اٹکاتی۔ ارشاد شاکر اعوان کے کلام کا اکثر حصّہ سہلِ ممتنع کی مثال پیش کرتا ہے۔ عربی و فارسی کے فاضلِ اجل ہونے کے باوصف آپ نے اِن زبانوں کے دقیق و ثقیل الفاظ و تراکیب کے استعمال سے اپنے کلام کو گراں بار نہیں کیا۔ اُن کی نظمیں مقصدیت کی حامل ہیں۔ وہ شاعری میں مقصدیت کے نظریے کے حامی ہیں اور شعر و ادب کو تفنّنِ طبع کی بجائے اصلاحِ احوال اور حصولِ مقصد کا وسیلہ خیال کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر زرینہ ثانی:

> شاعر کو اپنے خیالات یا محسوسات کو نظم میں پیش کرنے کے لئے فنکارانہ چابکدستی، تخیئل کی بلندی، الفاظ پر دسترس اور شاعرانہ وجدان کی ضرورت ہے۔ (١٧)

ارشاد شاکر اعوان کا شعری سفر کم و بیش نصف صدی کے عرصے پر محیط ہے۔ اِس شعری سفر کے دوران میں کئی ادبی تحریکیں شروع ہو کر اپنے منطقی انجام کو پہنچیں۔ ان سب کے اثرات بھی آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ آپ کی شاعری وقتی اور ہنگامی نہیں ہے، بلکہ دائمی اثرات و صفات رکھتی ہے۔ آپ کی نظمیں اردو کے شعری ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

غرض یہ کہ ارشاد شاکر اعوان نے کم و بیش پچاس پچپن سال علم و فن اور ادب کی خدمت میں گزارے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ نِصف صدی کا قصہ ہے۔ آپ اپنے

ادبی، تحقیقی، تخلیقی، تنقیدی، لسانی، علمی، تدوینی اور تدریسی کارناموں کے باعث ہمیشہ قدر اور عقیدت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ نظم نگاری کی تاریخ میں کوئی بھی مؤرّخ ارشاد شاکر اعوان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

## حوالہ جات


۱۔ جابر علی سید، جدید شعر تنقید، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۲ء، ص:۵۴

۲۔ وزیر آغا، تنقید اور احتساب، جدید ناشرین لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۴۶

۳۔ عمران ازفر، نئی اردو نظم نئی تخلیقی جہت، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص:۵۷

۴۔ عمران ازفر، نئی اردو نظم نئی تخلیقی جہت، ایضاً، ص:۵۶

۵۔ قاری غلام رسول تانف، "انٹرویو"، برمنگھم لندن، ۱۲نومبر ۲۰۱۳ء

۶۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، خواب خیال اُجالا، قرطاس، فیصل آباد، ۲۰مئی ۲۰۱۵ء ص۵۱

۷۔ نذر عابد، ڈاکٹر، انٹرویو، بمقام، ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ، ۱۱نومبر ۲۰۱۳ء

۸۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، خواب خیال اُجالا، ایضاً، ص ۱۱۲، ۱۱۱

۹۔ اسماعیل گوہر، ڈاکٹر، برف کی دیوار اور سورج بکف شاعر، مشمولہ شعر و سخن، مدیر جانِ عالم، مانسہرہ، شمارہ اپریل ۲۰۰۱ء، ص:۴۵

۱۰۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، شاخ در شاخ، قرطاس، فیصل آباد، ۱۷مئی ۲۰۱۵ء ص۴۷

۱۱۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، خواب خیال اُجالا، ص ۱۰۳

۱۲۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، احوال، قرطاس، فیصل آباد، ۲۷جون ۲۰۱۵ء ص۱۲۸، ۱۲۷

۱۳۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، شاخ در شاخ، ص ۸۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۹، ۹۸

۱۵۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، انٹرویو، بمقام، پیپلز کالونی، فیصل آباد، ۷نومبر ۲۰۱۴ء

۱۶۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، خواب وخیال اجالا، از ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، پیش لفظ، ایضاً، ۲۰۱۵ء، ص:۰۹

۱۷۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، ناشر: سیماب اکاڈمی، بمبئی، ۱۹۷۸ء ص:۱۹

ارشد محمود
پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
ڈاکٹر محمد اسماعیل بن عبد السلام
استاد، شعبہ عربی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

# عربی شعراء کے قتل کے اسباب (عہد جاہلیت تا عہد عباسی)

## Reasons of killing of Arabic poets

Arabic Literture emerged with its two major kinds; Prose & Poetry. It is distinguished by its rhetorical expressions and attracts its reader and strike to his mind and heart. Arabic Poetry is considers the oldest form of literature than the Prose. The conection of Arabic Poetry goes back to the pre-islamic period. The Arabic Poetry of that era is characterized by its originality and a real picture of life. What ever the poet has observed from the society and the environment placed his idea in the form of poetry. Arabic Poetry has its themes like; satire, eulogy, elegy and erotic etc. Eulogy was the targeted source of the poets to get the precious gifts from the kings. Sataric Poetry was like a weapon against the enemy of a tribe which led to the intermittent war between the different tribes. Satire, Erotic and Atheism resulted in the killings of Poets. This article deals with the poets who were killed by different factors in different era like pre-islamic period, ummaya period and abbasi period. The article has been divided into two chapters; 1. Arabic Poetry (emergence, development). 2. Reasons of killing the poets.

**Keywords:** *Arabic Poetry; Satire; Eulogy; Saleek; Hudba.*

عربی زبان میں ایک طرف سیاسی شاعر کا وجود اور عروج ہوا۔ اور دوسری طرف میدان خطابت میں بھی ایسے قادر الکلام فصیح و بلیغ اور شعلہ بیان مقرر پیدا ہوئے جن کی مثال عربی ادب میں نہیں ملتی۔ سیاسی شاعری میں جن شعرا نے کمال حاصل کیا ان میں ممتاز مسکین الدارمی، اخطل، جریر، فرزق، ابو العباس الاعمی اعشی ربعیہ اور عدی بن الرقاع ہیں۔ ان شعراء کو قرآن و حدیث کا معجز نما اسلوب بیان ورثہ میں ملا تھا۔ خداداد صلاحیت اور فہم و ذکا قدرت سے اور ان سب کو بروئے کار لانے کا داعیہ سیاسی حالات اور مادی منفعت سے ہے۔ انہوں نے بنو امیہ کی مدافعت میں اپنا زور طبع اور فطری صلاحیتیں لگادیں جس کی وجہ سے عربی ادب میں نئے نئے مضامین، اچھوتے

خیالات اور منجھا ہوا ایک خاص اسلوب بیان پیدا ہوا جو بے حد پسندیدہ اور مقبول تھا۔ پھر ان شعرا کی آپس کی ادبی جھڑپوں سے بھی شاعری میں نت نئی راہیں کھلیں جریر، فرزق اور اخطل کی شاعرانہ چشمکیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ ان شعراء میں اکثر نے دوسرے اصناف مثلاً غزل، مدح، ہجو اور مرثیہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

عباسیوں کے خلافت پر قابض ہونے سے شاعروں کو کچھ معمولی سی آزادی حاصل ہوئی تو شیعہ شعراء اپنے عقائد و نظریات اہل بیت کی مدح کے ساتھ بیان کرنے لگے ان افراد میں سے سعید حمیری اور دعبل کا نام قابل ذکر ہے اسی طرح عباسی مشہور شاعر ابو العتاہیہ تھے۔

دینی اشعار کا موضوع کہ جسے شریف رضی نے عروج پر پہنچایا مھیار دیلمی کے ذریعے جاری رہا۔ مھیار دیلمی ایک زرتشتی شخص تھے انہوں نے اسلام قبول کیا اور کوشش کی کہ ایرانی قومیت کی طرف اپنے واضح رجحانات کو اہل بیت کی دوستی کے ساتھ مخلوط کرے کلی طور پر ہم کہیں گے کہ عربی اشعار اگرچہ اسلامی ادوار میں مختلف نشیب و فراز میں گزرتے رہے اور برجستہ شعراء کی تربیت ہوئی لیکن یہ گمان نہیں کرنا چاہے کہ ان تمام اشعار کے مضامین فقط دینی تھے بلکہ عربی شعراء نے مختلف میدانوں میں طبع آزمائی کی جیسے ابو العتاہیہ نے زہد و حکمت، بشار بن برد نے ہجو اور بحتری نے مدح سرائی میں اشعار کہے۔

اسلام کے آغاز سے ہی عربی ادب خصوصاً شاعری خاص توجہ کا مرکز بن گئی اسلامی فتوحات عربی اشعار میں اپنا جلوہ دکھانے لگیں اور عبد اللہ بن رواحہ، کعب بن مالک، حسان بن ثابت وغیرہ جیسے برجستہ شعراء کے آنے سے آہستہ آہستہ قرآنی کلمات اور مضامین بھی عربی شاعری میں سمونے لگے حسان بن ثابت نے پیغمبر اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ کی دس سال تک مدح و ستائش میں قصائد کہے اور انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی وفات پر مرثیہ سرائی بھی کی۔

قرآن مجید کے بعد اولین اسلامی منثور آثار احادیث نبوی ہیں جن کی نثر روان اور سادہ ہے۔ خطوط اور عہدنامے وغیرہ جن میں سیاسی اور اجتماعی موضوعات پائے جاتے ہیں کو دینی متون کی حیثیت حاصل ہے۔ پہلی صدی ہجری میں عربی نثر مذکورہ موضوعات تک ہی محدود رہی ہے۔

کمیت (١٢٦- ٦٠ قمري) کے اشعار ہاشمیات کی شکل میں آگئے اور روز بروز روحانی رنگ ان پر بڑھنے لگا۔ اسکے اہم ترین دینی اشعار چار قصیدے ہیں کہ جو ہاشمیات کے نام سے شہرت پاگئے۔[1]

زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ عربی ادبیات نے زیادہ سے زیادہ اسلامی تہذیب کو اپنے اندر جذب کیا اسطرح کہ بہت کم ہی کوئی خطبہ یا تحریر مل سکے گی کہ جسکا آغاز قرآنی مناجات اور نبی اکرم (ﷺ) کی مدح سے نہ ہو اسی طرح اخلاقی اقدار کے متعلق زمانہ جاہلیت کے بہت سے کلمات نے بتدریج اپنے مفاہیم بدل لئے اور کلمات مثلاً شجاعت، وفا، صداقت، صبر اور سخاوت وغیرہ قیمتی اور معنوی کلمات میں تبدیل ہو گئے۔

مقالہ کے شروع میں بطور تمہید عربی شعر وشاعری سے متعلق بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد عہد جاہلیت تا عصر عباسی شعراء کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے اسکو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا:

١۔ عربی شاعری کا مفہوم ٢۔ مقتول شعراء کے اسباب

**شاعری کا پس منظر قرآن کی روشنی میں:**

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "شعر" ایک دفعہ ذکر ہوا ہے جبکہ شعراء کا عمومی ذکر بھی ایک مرتبہ آیا ہے، اور "شاعر" کا لفظ قرآن میں چار مرتبہ ہوا ہے اور یوں مجموعی طور پر چھ آیات ایسی ہیں جن میں شعر وشعراء کا ذکر آیا ہے۔

قرآن پاک میں لفظ "شعر" ایک مرتبہ آیا ہے، فرمان پروردگار ہے:

﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ﴾[٢]:

ترجمہ: اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کو شایاں ہے، یہ تو محض نصیحت اور صاف صاف قرآن (پُر از حکمت) ہے۔

قرآن کی آیات میں اللہ تعالی نے کفار کے اس دعوے کی نفی کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ شاعر ہیں، قول ربانی ہے:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ﴾[٣]

ترجمہ: یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم میں سے کم ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔

**عربی شاعری کی ابتداء**

عربی شاعری کی ابتداء "رجز" سے ہوئی جو دو چار شعر سے زائد نہ ہوتی تھی۔ سب سے پہلے جس شخص نے قصیدہ کہا وہ مہلہل بن ربیعہ ہے۔ یہ قصائد ان کے مقتول بھائی کی مرثیہ خوانی اور اس کے قصاص کے لیے تحریص وترغیب پر مشتمل تھے۔ مہلہل پہلا شخص ہے جس نے تیس شعر کا قصیدہ کہا۔ مہلہل کا اصلی نام "عدی" تھا، چونکہ اس نے قصیدے کہے اس وجہ سے اس کا نام مہلہل ہو گیا۔ "ہلہل الثوب" کی معنی کپڑے بننے کے ہیں۔

مہلہل کے بعد امرؤ القیس، علقمہ، عبید پیدا ہوئے۔ اس سے پہلے شاعری رجزیہ اشعار یا مقطعات تک محدود تھی جن کے لیے عنبر بن عمر بن تیم درید بن زید بن نہدا عصر بن سعد بن قیس، عیلان، زہیر بن خباب الکلبی، افوہ اودی اور ابی دواوالایادی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان کا زمانہ مہلہل سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ یہی دور اسلامی ترقی، فتوحات اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ممتاز زمانہ رہا ہے۔ عربی زبان میں تمام علوم و فنون منتقل ہوئے۔ تاریخ عالم منضبط کی گئی۔ مختلف تمدنوں سے عرب کو سابقہ پڑا۔ جغرافیائی نقطہ نظر سے عربی زبان دنیا کی کثیر آبادیوں تک پہنچی اور عربی شاعری عالم کے مختلف تاریخی و جغرافیائی، تمدن کے اختلاط سے متاثر ہوئی۔

**شاعری کے اھداف حسب ذیل رہے:**

ا۔ خاندانی کارناموں پر مفاخرت مذہبی سیاسی علمی کاموں میں تقابل، سیاسی اغراض کے تحت شاعری کا پرچار۔ خاص طور پر بنی اُمیہ کے خلفاء نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

۲۔ خوشامدی اسالیب کا اختیار۔

۳۔ زندانہ شاعری جس میں شراب کی تعریف۔ بزم نشاط۔ ساقی مطرب اور شاہد پرستی، گانے کی توصیف وغیرہ شامل ہے۔

۴۔ وصف نیچرل شاعری، چنانچہ باغات، چمنوں کے مناظر، فطرت کے مناظر کی تشریح، شکار اور دیگر تشبیہات وغیرہ۔

۵۔ وعظ، حکمت و فلسفیانہ اقوال۔

٦۔ بعض علوم و فنون کے قواعد کو بغرض آسانی حفظ نظم کرنا۔

**سلیک بن سلکۃ**

دور جاھلیت کی عمیق تاریخ میں مدہم روشنی کی طرح ایک نام سلیک ہے۔ اس کا مکمل نام سلیک بن سلکۃ بن عمرو ہے۔[۴] بعض تاریخی روایات کے مطابق ابن عمیر یثربی کے نام سے بھی جانا گیا ہے اس کا تعلق بنی مقاعس سے ہے اس کی وفات تقریباً ٦۰۵م میں ہوئی۔ سلسلہ نسب بنی تمیم تک جا پہنچتا ہے جبکہ سلکۃ اسکی والدہ کا نام ہے اور وہ بھی شاعرہ ہے جس نے اپنے بیٹے سلیک کی وفات پر مرثیہ کہا ہے۔ سلیک کا تعلق صعالیک شعراء سے بھی ہے جو کہ خانہ بدوش طرز کی زندگی گزارتے تھے اور ان کا مستقل مسکن نہ تھا جبکہ دوسرے قبیلوں پر حملہ آور ہونا اور مخالفت

پر کسی کو قتل کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ سلیک دوڑنے میں بہت مشہور تھا جبکہ اس کی نسبت سے کہا جاتا تھا کہ فلاں سلیک سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ اس نے اپنے وقت میں کچھ نوجوانوں کو مقابلہ دوڑ کے لئے للکارا اور لوہے کی رزہ پہن کر دوڑ میں شریک ہوا اور سب پر سبقت لے گیا۔

اس کے القاب: اس کے القاب میں اِسی کے دور میں اسکی تیز رفتاری کی مثال دی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا: "أعدي من السليك"[٥]، یعنی سلیک سے بھی زیادہ تیز رفتار، سلیک المقانب، الرئبال، الشيطان اور أشعر العرب یعنی زیادہ شعر کہنے والا کے القاب اس سے منسوب ہیں جبکہ الشیطان کا لقب اسکی ھجویہ شاعری اور قبائل پر حملہ کرنے کی وجہ سے منسوب ہے۔

سلیک کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے اس راز سے بھی پردہ اٹھتا ہے کہ وہ دوسرے قبیلوں پر حملہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی اس کے ہاتھ آتا اسے استحقاق سمجھتے ہوئے اپنی ملکیت تصور کرتا۔[٦] تاریخ کے اوراق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مضر قبیلہ پر حملہ نہیں کرتا تھا بلکہ یمنی قبیلہ پر حملہ آور رہا، اگر یہ ممکن نہ ہوا تو ربیعہ کے قبیلہ پر حملہ آور ہوا[٧]۔ اغیار کے مال پر قبضہ کرنے اور دوسرے قبیلے پر جھپٹنے کی ذمیم خصلت کے باوجود اپنے قبیلے کے غرباء کا خیال رکھتا اور دشواری وقت میں ان کی معاونت بھی کرتا۔ زمین کے اندر کسی چیز کو پوشیدہ رکھنے اور طویل عرصہ بعد اُسی جگہ کا اندازہ لگانے میں ملکۂ خاص رکھتا تھا[٨]۔ قبائل پر حملہ آور ہونے اور سرقہ کی زندگی گزارتے ہوئے خود بھی حملہ کا شکار ہوا اور قتل کیا گیا۔

سلیک اپنے بعد جو اشعار چھوڑ کر گیا وہ بہت کم ہیں لیکن زندگی کی حقیقی تصویر سے تعبیر کئے جاتے ہیں جب بنی عوارۃ سلیک کو قتل کے ارادہ سے آئے اُس وقت سلیک نے "فکیھۃ" نامی عورت کے ہاں پناہ لی جس نے سلیک کو قتل ہونے سے بچایا اور اس کا دفاع کیا، اس امر پر سلیک نے یہ شعر کہا:

لعمرُ أبيكَ والأنباءُ تُنمَى لَنِعمَ الجارُ أختُ بنِي عوازا[٩]

اس میں سلیک نے بنی عورۃ کی بیٹی کی مدح کی اور کہا کہ اُس نے بنی عوارۃ کی پناہ لی جس نے اُسے موت کی وادی سے نکالا۔

ھجویہ شاعری سلیک کی ہلاکت کا باعث بنی جبکہ اس نے مالک بن عمیر جو خثعم قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا کی ھجو کی۔ سلیک نے ایک عورت سے تعلق استوار کیا جبکہ اُس عورت نے سلیک کو خثعم قبیلہ سے ڈرنے کا کہا کہ تیرے عمل کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ اس بناء پر سلیک نے خثعم قبیلہ کی ھجو کی اور کہا:

تحذرني كي أحذَر العامَ خثعما وقد علمتُ أني امرؤٌ غير مسلم
وما خثعمُ إلا لِئام أذلةٌ إلى الذّل والإسحاقِ تنمي وتَنتمي[١٠]

مجھے خثعم قبیلہ سے نہ ڈرایا جائے میں مرعوب نہیں ہوتا اور نہ ہی میں پیچھے ہٹنے والا ہوں جبکہ خثعم کیا ہے وہ تو صرف ایک ذلت وتباہی کا استعارہ ہے۔

یہ اشعار خثعمی قبیلہ تک پہنچے، نتیجتا انتقام کی آگ طرفین میں بڑھکی۔ انس بن مدرک الخثعمی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا اور سلیک سے مقابلہ کیا جس میں سلیک مارا گیا۔

**ھدبۃ بن خشرم**

اس کا نام ھدبۃ بن خشرم بن کرز بن ابی حیۃ ہے۔ جو کہ اسلامی شاعر ہے اور اسکی شاعری فصیح زبان میں ہے۔ شاعر کا تعلق قبیلہ عذرۃ سے ہے۔ انساب کی کتابیں اس کا نسب قضاعۃ تک بیان کرتی ہیں۔ ابو سلیمان اس کی کنیت جبکہ عذرۃ خاندان کی نسبت سے اس کا لقب ہے۔ ھدبۃ کا تعلق شاعر خاندان سے ہے۔ اس کی والدہ حیۃ بنت بکر شاعرۃ تھی۔ تبریزی نے اس کا نام ریحانہ بھی ذکر کیا ہے۔ ھدبۃ کے بھائی حوط، سیحان اور واسع شعراء تھے جبکہ اس کی دو بہنیں سلمی اور فاطمہ بھی شاعرہ تھیں۔ اس کی بیوی اس وقت کی خوبصورت خواتین میں سے تھی اور اس کا تعلق قبیلۃ قضاعۃ سے تھا۔ اپنے شوہر کی وفادار رہی، ھدبۃ کی موت کے بعد اس کی بیوی نے اپنا ناک اور ہونٹ اس بناء پر کاٹے کہ شادی کی رغبت نہ رہے۔ جمیل بن معمر شاعر سے ملاقات کی روایات ملتی ہیں، جس نے ھدبۃ کو کپڑے اور نفقہ دیا لیکن ھدبۃ نے اسے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ جمیل نے ابن عامر کی ھجاء کی تھی جو کہ ھدبۃ کے قبیلہ سے تھا۔[١١]

**شاعری:**

ھدبۃ کی شاعری کے حوالہ سے مصادر بہت کم ہیں۔ شعر کی روایت حزن اور اضطرابی کیفیت پر مشتمل ہے کیونکہ چچازاد سے اختلاف کی وجہ سے کچھ عرصہ زنداں کی نظر ہوا۔ اسکی شاعری صدق کی ایک نمایاں اور منفرد تصویر ہے۔ اسکی شاعری جو ہم تک منتقل ہوئی وہ اس وقت کی ہے جب ھدبۃ پابند سلاسل تھا۔ دیگر شعراء کی مانند اس کا ضخیم دیوان نہیں۔ ابن ندیم نے ذکر کیا ہے کہ زبیر بن بکار نے اپنے مجموعہ میں ھدبۃ بن خشرم اور زیادۃ بن زید کی اخبار جمع کی ہیں۔[١٢] اس کی شاعری کا بیشتر حصہ ضائع ھو جانے کے واضح اور صریح اشارات موجود ہیں۔ نقاد کو اس کی شاعری کا جو حصہ ملا اُس پر یہ رائے قائم کی کہ یہ کسی قصیدہ کا جزء ہے یعنی اس کی شاعری مقطوعات اور ٹکڑوں پر

مشتمل ہے۔ اس نے جاھلی شاعر زھیر بن ابی سلمی کی شاعری کا منہج اختیار کیا۔ عرب نقاد واد باء نے اس کی شاعری کی تحسین کی کیونکہ اس میں سچے احساسات، الم فراق اور حزن کی صادق تعبیر ہے۔ اکثر شاعری بدیہی اور ارتجالی ہے جس میں جودت کی صناعت پائی جاتی ہے۔

**اس کی شاعری علماء کی نظر میں:**

نقاد اور ادباء نے ھدبۃ کی شاعری کو سراہا کیونکہ اس کی شاعری کے پس منظر میں ایک عمدہ اور حقیقی تصور تھا۔ قید و بند کی صعوبتیں اور فِراق کے درد میں مبتلا جو احساسات پروان چڑھے اس کی تصویر ھدبۃ کے شعری نمونہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اصفھانی کہتا ہے کہ اسیری میں عربوں سے زیادہ شعر کہنے والا ھدبۃ ہے[١٣]۔ ابن رشیق نے ذکر کیا ہے کہ امن اور خوف کے مابین بدیہیت اور ارتجالیت پر قائم رہنے والے چند شعراء ہیں ان میں ھدبۃ بن خشرم اور طرفۃ بن العبد ہیں۔[١٤]

ھدبۃ کی ارتجالیت کی واضح تصویر معاویہ کی مجلس میں نظر آتی ہے جب ھدبۃ اور عبد الرحمن کو شام کی طرف بھیجا گیا اُس وقت معاویہ نے کسی امر کے بارے استفسار کیا۔ ھدبۃ نے کہا: اس ویسے ہی بتاؤں یا شعر کی صورت میں۔ معاویہ نے کہا: شعر کی صورت میں۔ ھدبۃ نے معاویہ کی خواہش کے مطابق شعری نہج پر امر کو عرض کیا۔[١٥]

ھدبۃ اور زیادۃ شام سے واپسی پر اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ سفر میں تھے۔ مرحلہ وار قافلہ کی قیادت اور رہبری کرتے اور ترنم سے اشعار پڑھتے۔ زیادۃ نے ھدبۃ کی بہن پر غزلی شاعری کہی، ھدبۃ غصہ ہوا اور زیادۃ کی بہن پر فحش گوئی کی۔ دونوں میں حدّت بڑھی۔ دونوں شعراء نے جو اشعار کہے ان میں فحش گوئی بہت زیادہ ہے جنکو یہاں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو مطالعہ کرنے کے لئے اغانی سے یا الشعر والشعراء سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

**ھدبۃ کو موت:**

ھدبۃ اور زیادۃ کے درمیان اختلافات اور جھگڑے شدت اختیار کر گئے۔ ھدبۃ کی شدت غصہ کی وجہ یہ ہے کہ زیادۃ نے جب شعر کہے، ھدبۃ کی بہن یہ ابیات سُن رہی تھی، جبکہ ھدبۃ نے جب زیادۃ کی بہن پر اشعار کہے وہ وہاں نہیں تھی۔ ھدبۃ کی بہن کا فوراً اشعار سننا اس کے غصہ کی آگ کو مزید بڑھانے کا سبب بنا اور اس کی غیرت میں اشتعال پیدا کیا۔ اسی سبب پر ھدبۃ نے زیادۃ کو قتل کر دیا اور خود پابند سلاسل ہو گیا۔ زیادۃ کے خاندان نے دیت کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور خون کا بدلہ خون سے لینے کا فیصلہ کیا۔ زیادۃ کا بیٹا مسور سَنِ بلوغت کو پہنچا اور اپنے باپ کا بدلہ لیا۔ ھدبۃ زنداں سے نکل کر موت کی بیڑیاں پہن کر ابدی نیند سو گیا۔

## متنبی (پیدائش ۳۰۳ھ وفات ۳۵۴ھ)

### پیدائش اور حالات زندگی:

ابو طیب احمد بن حسین متنبی کوفہ میں نادار والدین کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوفہ میں بہشتی کا کام کرتا تھا، ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اس کا باپ دیہات سے نکل کر شہری زندگی گذارنے کے لیے وہاں سے سفر کر کے شام میں منتقل ہو گیا۔ وہ اپنے بچے کو مدارس میں بھیجتا رہا اور مختلف قبائل میں اس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ہونہار بچہ کے آثار و قرائن بتا رہے تھے کہ یہ فاضل بنے گا اور کامیاب زندگی گذارے گا جب باپ کی وفات ہوئی تو وہ جوانی میں قدم رکھ رہا تھا اور علوم لغت و ادب سے خاص دلچسپی پیدا کر چکا تھا چنانچہ اب وہ روزی کمانے اور مدوسروری سے ہمکنار ہونے کے لیے سفر کرنے لگا۔

بچپن ہی سے متنبی سبک روح، عالی ہمت، بلند حوصلہ اور مجد و سروری کی طرف مائل تھا بڑا بننے ہی کا شوق تھا جس نے اسے نوجوانی اور ناتجربہ کاری کی عمر میں لوگوں سے اپنی خلافت کی بیعت پر ابھارا اور بیعت کا معاملہ پورا ہوا ہی چاہتا تھا کہ علاقہ کے گورنر کو اس سازش کی اطلاع مل گئی اور اس نے اسے قید کرنے کا حکم دے دیا۔ جیل خانہ سے اس نے گورنر کو ایک قصیدہ بھیجا جس میں کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| أمَالِكَ رِقّي ومَنْ شَأنُهُ | هِباتُ اللُّجَينِ وعِتْقُ العَبيدِ |
| دَعَوْتُكَ عِندَ انْقِطاعِ الرّجَا | ءِ والمَوْتُ مني كحَبل الوَريدِ |
| دَعَوْتُكَ لما بَراني البَلاءُ | وأوْهَنَ رِجْليّ ثِقْلُ الحَديدِ |
| تُعَجّلُ فيّ وُجوبَ الحُدودِ | وَحَدّي قُبَيلَ وُجوبِ السّجودِ |
| امالك رقى ومن شانه | هبان الجين و عتق العبيد |
| دعوتك عند انقطاع الرجا | ء والموت نى كجل منى كحبل الوريد |
| دعتك لما برانى البلى | وأوهن رجلى نقل الحديد |
| تعجل فى وجوب الحدود | وحدى قبل وجوب السجود(١٦) |

اے میرے آقا! جس کا کام ہی دولت بخشنا اور غلاموں کو آزاد کرنا ہے، میں آپ سے امید منقطع ہو چکنے اور اپنا گلا موت کے ہاتھ میں پہنچ جانے کے وقت مدد کی درخواست کرتا ہوں، اس وقت میں آپ سے مدد کا خواہاں ہوں جب کہ میری حالت خستہ ہو چکی ہے اور میری ٹانگوں کو بیڑیوں کے بوجھ نے کمزور کر دیا ہے، ابھی سے مجھ پر حدود قائم کی جا رہی ہے حالانکہ ابھی تو مجھ پر نماز بھی فرض نہیں ہوئی ہے۔

چنانچہ گورنر نے اسے رہا کر دیا لیکن تمنائے سروری اس کے دل و دماغ میں اس طرح سما چکی تھی کہ جوانی ختم ہو جانے کے بعد بھی اس نے شام میں نبوت کا دعویٰ کر ڈالا۔ اور اپنی جادو بیانی، نیز ادبی قوت سے کام لے کر لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کو اپنا مرید بنالیا اور جب اس سے آنحضرت ﷺ کے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے کہا "آپ ﷺ ہی نے تو میری آمد کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا کہ "لا نبی بعدی" یعنی میرے بعد "لا" نامی شخص نبی ہو گا اور میرا نام آسمان میں "لا" ہے"۔ اس نے قرآن کے مقابلہ میں اپنا کچھ کلام بھی پیش کیا تھا۔ جب اس کا یہ دعویٰ مشہور ہوا تو واخشیدیہ کے نائب امیر حمص نے اسے گرفتار کر لیا اور اسے توبہ کرنے پر اس وقت رہا کیا جب اس کے مریدین کا حلقہ ٹوٹ گیا۔ پھر وہ اپنی بلند آرزوؤں سے بھی دور کے سفر کرنے لگا اور اس سفروں میں اس کے پاس صبر و ثبات، عزم و ہمت کے سوا کوئی زاد راہ نہ ہوتا جیسا کہ اس کے متعدد اشعار سے معلوم ہوتا ہے مثلا:-

وَحيدٌ مِنَ الخُلاّنِ في كلّ بَلْدَةٍ إذا عَظُمَ المطلُوبُ قَلّ المُساعِدُ[١٧]

وہ ہر شہر میں دوستوں کے بغیر تن تنہا ہے جب مقصود عظیم ہوتا ہے تو مددگار کم ہو جاتے ہیں۔

نیز:

ضاقَ صَدري وطالَ في طَلَبِ الرّزْ قِ قيامي وَقَلّ عَنهُ قُعُودِي

ضاق صدری وطال في طلب الرز ق قیمی وتل عنه تعودی

ابدا اقطع البلاد ونجمی في نحوس وهمتی في سعود[١٨]

میں دل برداشتہ ہو گیا ہوں، طلب معاش میں ہر دم مارا مارا پھرتا رہتا ہوں اور اس طرف سے مجھے طمانیت نہیں ملتی، سدا ایک ملک سے دوسرے ملک کا قصد کرتا رہتا ہوں میرے تارے نحوست میں ہوتے ہیں لیکن ہمت سعادت میں رہتی ہے۔

وہ اسی طور سے ادھر ادھر پھرتا رہا تا آنکہ سیف الدولہ کی طرف سے انطاکیہ میں مقرر کیے ہوئے گورنر ابو العشائر سے اس کا تعلق ہو گیا، اس نے اس کی مدح بھی کی، چنانچہ گورنر نے اس کی عزت افزائی کی، اسے سیف الدولی کے حضور پیش کیا، اس کے سامنے متنبی اور اس کے شعر و ادب کی صلاحیتوں کا تعارف کرایا اور اس کا بلد مقاما بتایا، چنانچہ حاکم نے اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا اور اس کا بڑا احترام کیا اسے جنگ اور شہسواری کی تربیت کے لیے متعلقہ ماہرین فن کے پاس بھیجا تا کہ وہ امن و جنگ میں اسے اپنے ہی ساتھ رکھے اور کسی وقت بھی جدا نہ کرے۔ ساتھ ہی اسے خوب آسودہ اور مالا مال کر دیا حتی کہ وہ خود کہتا ہے:

تَرَكْتُ السُّرَى خَلفي لِمَنْ قَلّ مالُه وَأنعَلْتُ أفراسي بنُعْماكَ عَسجَدَا
وَقَيّدْتُ نَفْسِي في ذَرَاكَ مَحَبّةً وَمَنْ وَجَدَ الإحْسانَ قَيْداً تَقَيّدَا
تركت السرى خلفى لمن قل ماله والعلت افراسى بنعماك عسجدا
وقيدت نفسى فى هواك محبة ومن وجد الاحسان قيد اتقيدا(١٩)

میں نے راتوں کا سفر اپنے پیچھے ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جن کے پاس مال کی کمی ہے اور میں نے تیرے انعامات واحسانات کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو سونے کی نعلیں لگوالیں اور میں نے تیرے لطف وکرم کی وجہ سے اپنے آپ کو تیری محبت میں محصور و مقید کر دیا اور جو بھی احسان کو بیڑی کی صورت میں پاتا ہے وہ قید ہو جاتا ہے۔

الغرض وہ اس کے ساتھ نہایت اطمینان و آسودگی سے زندگی گذار رہا تھا کہ کسی وجہ سے ان کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی اور وہ ٣٤٦ھ میں اس سے جدا ہو کر مصر چلا گیا وہاں کافور اخشیدی اور ابو شجاع کی مدح کرتا رہا اور ایک زمانہ تک کافور کی نظر عنایت کا منتظر رہا کہ وہ اسے کسی بڑے منصب پر فائز کر دے لیکن تا بکے؟ آخر اسے کہنا ہی پڑا:

أبا المِسْكِ هل في الكأسِ فَضْلٌ أنالُه فإنّي أُغَنّي منذُ حينٍ وَتَشرَبُ(٢٠)

اے ابو المسلک! (یہ کافور کی کنیت ہے) کیا جام میں کچھ میرے لیے بھی بچے گا؟ میں مدتوں سے گا رہا ہوں اور آپ پیئے چلے جارے ہیں؟

وَهَل نافِعي أنْ تُرْفَعَ الحُجبُ بَيْنَنا وَدونَ الذي أمّلْتُ مِنْكَ حِجابُ
وَفي النّفسِ حاجاتٌ وَفيكَ فَطَانَةٌ سُكُوتي بَيَانٌ عِنْدَها وَخِطابُ
وهل نافعى ان ترفع الحجب بيننا ودون الذى املت منك حجاب
وفي النفس حاجات وفيك طفانة سكوتي بيان عندها وخطاب(٢١)

ہمارے درمیان کے حجابات دور ہو جانے سے مجھے کیا فائدہ ہو گا جب کہ وہ امید جو میں آپ سے لگائے بیٹھا ہوں ابھی تک آپ سے پردہ میں ہے میرے دل کے ارمان دل ہی میں ہیں اور آپ ان سے خوب واقف ہیں کیوں کہ آپ میں اندرونی حلات بھانپنے کی صلاحیت ہے نیز خود میری خاموشی زبان حال سے اس قلبی کیفیت کو کھول کر بیان کر رہی ہے۔

اس کی اس قسم کی طنزیہ شاعری، تعلی اور شوق امارات سے کافور کو اس کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا اور وہ اس سے روگردانی کرنے لگا۔ اس پر متنبی نے اس کی ہجو کہہ ڈالی اور بغداد کا رخ کر لیا چونکہ وہ بالعموم بادشاہوں سے کم درجہ کے لوگوں کی مدح کہنا کسر شان خیال کرتا تھا اس لیے وزیر مہلبی کی اس نے مدح نہ کی جس نے مہلبی نے برا مانا اور انتقاما بغداد کے شاعروں کو اس کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے اس کی اور اس کی شاعری کی خوب گت بنائی۔ لیکن متنبی ان کے منہ نہ لگا اور فضل بن عمید سے ملاقات کرنے کے لیے ارجان روانہ ہو گیا صاحب بن عبد اد وزیر نے اس خیال سے کہ وہ اس کی مدح کرے گا اسے اصفہان آنے کی دعوت دی لیکن وہ اسے خظرہ میں نہ لایا اور عضد الدولی سے ملنے کے لیے شیراز کا قصد کر لیا، اس پر صاحب اس سے جل گئے اور غصہ میں اس کے کلام کی خامیاں نکالنے اور اس پر نکتہ چینی کرنے لگا حالانکہ وہی اس کے محاسن کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔ چنانچہ صاحب اور اس کے ساتھیوں نے اس کے خلاف محاذ قائم کر کے اس کے خلاف قلمی جنگ برپا کر دی، اس پر سرقۂ مضامین اور ادب عربی کے اسالیب سے بغاوت کا الزام لگایا، لیکن خود اعتمادی اور اپنی شاعری پر ناز ہونے کی وجہ سے متنبی نے ان ناقدین میں سے کسی کو در خود اعتناء نہ سمجھا۔

متنبی کا بنی ضبۃ کے کچھ لوگوں سے سامنا ہوا جن میں ضبۃ بن زید نامی شخص کی متنبی نے ھجاء کی اور کہا:

ما أنصف القومُ ضبة وأمّه الطرطبه
وما عليك من القتل وإنما هي ضربة
وما عليك من العذر إنما هي سُبَّة(٢٢)

ان ھجویہ اشعار میں ضبۃ کی غیرت اور حمیت میں اشتعال پیدا کیا جبکہ یہ اشعار ضبۃ کی ماں کے بھائی فاتک بن ابی جھل الاسدی تک پہنچے اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا۔ چنانچہ بغداد کے علاقہ صافیہ میں وہ ایک دوسرے کے بالمقابل آئے اور جنگ ہونے لگی جب متنبی نے اپنی کمزوری اور شکست کا اندازہ لگا لیا تو بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے غلام نے اس سے کہا" کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں "بھگوڑے" کہلاؤ حالانکہ تم نے یہ شعر کہا ہے:۔

الخيلُ والليلُ والبيداءُ تعرفُني والسيفُ والرّمحُ والقرطاسُ والقلمُ(۲۳)

گھوڑوں کے دستے، رات اور لق ودق صحرا، نیز تلوار، نیزہ، کاغذ اور قلم سب مجھے جانتے ہیں۔

چنانچہ وہ جنگ کرتا رہا تا حتی کہ وہ بھی قتل ہو گیا اور اس کے ساتھ اس کا لڑکا اور غلام بھی مارے گئے یہ ۳۵۴ھ اواخر رمضان کا واقعہ ہے۔

**اس کی شاعری:**

متنبی معنی آفریں شاعروں میں سے ہے اس نے شاعری و فلسفہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا اور اپنی بیشتر توجہ معنی پر صرف کی۔ اس نے شاعری کو ان بندشوں سے رہائی دی جن میں ابو تمام اور اس کے ہمنواؤں نے اسے قید کر دیا تھا اس نے عربی شاعری کو مخصوص قدیم عربی ڈگر سے نکالا۔ یہی عربی شاعری میں رومانی طرز انشاء (جس میں تخیل و جذبات کا زور ہوتا ہے اور نفس مضمون کو الفاظ و طرز اداء پر ترجیح دی جاتی ہے) کا قائد ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں حکم وامثال کو جگہ دی۔ جنگ کے وصف میں جدت طرازی، عرب کی دیہاتی عورتوں سے تشبیب، حسن تشبیہ، ایک شعر میں دو ضرب المثل لے آنا، حسن گریز، مدح کو انوکھا انداز۔ چبھتی ہوئی ہجو اس کی شاعری کی خصوصیات ہیں اور سب سے زیادہ جو چیز متنبی کو نمایاں اور ممتاز کرتی ہے وہ ہے شاعری میں اس کی شخصیت کا ابھر کر آنا، اس کا صدق ایمان و پختگی رائے، اس کی خودی و خود اعتمادی، نیز نفسیات، لوگوں کے ماغل دلی خواہشات و جذبات، حقائق کائنات، اور مقاصد حیات کی صحیح عکاسی اور پوری ترجمانی اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس کی شاعری ہر زمانے کے ادی کے لیے مددگار اور خطیب کے لیے معاون بنی رہی۔

**اس کی شاعری کے عیوب:**

کبھی کبھی متنبی کی شاعری میں مضمون و معنی تنگ، اور اسے سمجھنا دشوار، ہو جاتا ہے الفاظ سے بے توجہی کی بنا پر اس کی عبارت میں خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں مثلا بھونڈے الفاظ، معنوی تعقید، غریب و نامانوس الفاظ کا استعمال، مطلع بے ڈول، قیاس کی مخالفت، شاعری کے مضمون میں تفاوت، مبالغہ میں حد سے تجاوز کر کے اسے ناممکن حد تک پہنچا دینا، مثلا:

ولا الضّعْفَ حتى يَتبَعَ الضّعفَ ضِعفُه ولا ضِعفَ ضِعفِ الضّعفِ بل مثله ألْفُ(۲۴)

یا جیسے اس کا شعر ہے:

أنّى يَكُونُ أبَا البَرِيّةِ آدَمٌ وأبوكَ والثّقَلانِ أنْتَ مُحَمّدُ(۲۵)

کہنا یہ چاہتا ہے کہ انی یکون آدم ابا لابر ایا و ابوک محمد وانت الثقلان یعنی آدم کیونکر انسانوں کا جد اعلی ہو سکتا ہے، حالانکہ آپ کا باپ محمد ہے اور آپ ثقلان ہیں یا جیسے ایک جگہ وہ کہتا ہے:

لوْ لم تكنْ من ذا الوَرَى اللّذْ منك هُوْ عَقِمَتْ بمَوْلِدِ نَسْلِها حَوّاءُ[٢٦]

یعنی اے ممدوح اس دنیا میں جس کا وجود ہی تیری ذات سے ہے اگر تو نہ ہوتا تو مائی، حوا بانجھ ہو جاتیں اور ان کے کوئی اولاد نہ ہوتی۔

اس قسم کے پر تعقید شعروں کی مثالیں ہمیں ہمارے موضوع سے دور لے جائے گی لہذا جسے ان چیزوں کے معلوم کرنے کا شوق ہو وہ ثعالبی کی تصنیف "تیمیۃ الدھر" دیکھے۔

**شاعری کا نمونہ:**

زمانہ کا شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

لم يترك الدهر من قلبى ولا كبدى شيئا تتيمه عين ولا جيد

يا ساقيى اخمر فى كؤ وسكما ام فى كؤوسكما هم وتسهيد؟

اصخرة انا؟ مالى لا تغير فى هذى المدام ولا تلك الاناشيد

اذا اردت كميت الخمر صافية وجدتها وحبيب النفس مفقود

ماذا القيت من الدنيا وعجبها انى بما انا باك منه محسود[٢٧]

زمانہ نے میرے دل و جگر میں ایسی چیز باقی نہیں چھوڑی جسے (معشوق کی) نگاہ یا گردن مسحور کر سکے۔ ساقیا! تمہارے جام میں شراب ہے یا اس میں غم و فکر اور بے خوابی ہی بھری ہے؟ کیا میں پتھر ہوں؟ آخر کیا ہے کہ یہ شراب اور یہ نغمے مجھ میں تغیر پیدا نہیں کرتے؟ جب میں ارغوانی صاف شراب کی تمنا کرتا ہوں تو وہ مجھے مل جاتی ہے مگر دوسری طرف (اس کا جوڑ) محبوب مفقود ہوتا ہے مجھے اس دنیا سے ملا ہی کیا ہے؟ لیکن سب سے زیادہ حیرت و تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ جو مجھے ملا ہے اس میں تو نالاں اور بیزار ہوں لیکن لوگ ہیں کہ میری اس حالت پر بھی مجھ سے حسد کرتے ہیں۔

فلسفیانہ شاعری کرتے ہوئے کہتا ہے:

نحن بنو الموت فما بالنا نعاف مال بد من شربه

تبخل ايدنا برواحنا على زمان هن من كسبه

فهذه الرواح من جوه وهذه الاجسام من تربه

لو فکر العاشق فی منتهی حسن الذی یسبیه لم یسبه
لم یر قرن الشمس فی شرقه فشکت الانفس فی غربه
یموت راعی الضان فی جهله موتة جالینو فی طبه
وربما زاد علی عمره وزاد فی الامن علی سربه
عغایة المفرط فی سلمه کغایة المفرط فی حربه(۲۸)

ہم موت کے بیٹے ہیں (یعنی اس کے تابع ہیں) پھر آخر کیا سبب ہے کہ ہم اس چیز کو پینے سے گریز کرتے ہیں جس سے کوئی مفر ہی نہیں ہے؟ ہمارے ہاتھ زمانہ کو اپنی روحیں دینے میں بخل کرتے ہیں حالانکہ ہماری روحیں زمانہ کی کمائی ہیں یہ روحیں تو زمانہ کی فضا سے آتی ہیں اور یہ اجسام اسی زمانہ کی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اگر عاشق کبھی اس حسن کے انجام پر غور کرلے جس نے اسے بے داموں خرید لیا ہے تو وہ کبھی اس طرح بے خود نہ ہو جاتا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ جب سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہوا نظر آئے تو کسی کو اس کے غروب ہونے میں شک ہوا ہو بھیڑ بکریوں کو چرانے والا پانی لاعلمی و جہالت کے باوجود اسی طرح موت سے ہمکنار ہوتا ہے جس طرح جالینوس اپنی تمام طبی معلومات کے باجود مر گیا۔ بلکہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ زندہ رہتا ہے اور اپنے گھر بار کو زیادہ عافیت سے رکھتا ہے۔ اپنی حفاظت و احتیاط میں انتہائی کوشش کرنے والے کا بھی وہی انجام ہوتا ہے جو اپنے آپ کو بے دھڑک، جنگ میں ڈال لینے والے کا۔

نصیبك فی حیاتك من حبیب نعیبك فی منامك من خیال
رمانی الدهر بالا زراء حتی فؤادی فی غشاء من نبال
فصت اذا اصابتنی سهام تکسرت النصال عل النصال
فهان فما ابالی بالرزایا لانی ما انفعت بان ابالی(۲۹)

تمہاری زندگی میں تمہیں محبوب سے جو حصہ ملا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے خواب میں خیال سے معاملہ۔ مجھ پر زمانہ نے اس قدر آفتیں ڈھائی ہیں کہ میرا دل تیروں سے اٹا پڑا ہے اب حالت یہ ہے کہ جب مجھے تیر لگتے ہیں تو گویا وہ تیر تیر پر ہی لگ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور اب مشکلات میرے لیے آسان ہو گئیں کہ میں ان کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا، اس لیے کہ میں نے ان کی پروا کر کے ان سے کوئی فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔

صحب الناس قبلنا ذا الزمانا وعناهم من امره ماعنانا
و تو لوا بغصة كلهم منه وان سر بعضهم احيانا
ربما تحسن الصنيع ليا ليه ولكن تكدر الاحسانا
وكانا لهم ير ض فينا بريب الد هر حتى اعانه من اعنا
كلما انبت الزمان قناة ركب المرء فى القناة سنانا
ومراد النفوس اصغر من ان نتعادى فيه و ان نتفانى
غير ان الفتى يلاتى المنايا كالحات ولا يلاتى لاهوانا
ولو ان الحيوة تبقى لحى لعد دنا اضلنا الشجعانا
واذا لم يكن من الموت بد فمن العجز ان تموت جبانا(٣٠)

ہم سے پہلے بھی لوگ اس زمانہ میں رہے ہیں اور اس کی جو چیزیں ہمارے لیے باعث کوفت ہیں انہیں بھی پریشان کرتی رہی ہیں وہ سب اس سے غصہ ہو کر ہی واپس گئے ہیں گو کبھی کبھی اس نے کسی کو خوش بھی کیا ہے کبھی اس کی راتیں کوئی بھلائی اور احسان بھی کر جاتی ہیں مگر جلد ہی وہ کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صرف زمانہ کی گردشوں پر ہی راضی نہیں بلکہ اس کی مصیبتوں میں اور اضافہ کرنے کے لیے ہم میں سے بعض اس کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی زمانی کوئی بانس اگتا ہے تو انسان اس کے اوپر ایک آہنی پھل کا اضافہ کر کے اسے نیزہ بناڈالتا ہے انسانوں کے دلوں کی خواہشات اور ان کے تقاضے اس سے بہت ہی حقیر و کمتر ہیں کہ ہم ان میں ایک دوسرے سے دشمنی کریں اور لڑے مرتے رہیں لیکن بات یہ ہے کہ انسان بھیانک موتوں کا سامنا کر لیا ہے لیکن ذلت کا سامنا نہیں کرتا اور اگر کسی زندہ کے لیے زندگی ہمیشہ رہ جاتی تو ہم بہادروں کو سب سے زیادہ نامعقول و گمراہ شخص تصور کرتے اور جبکہ۔۔۔۔ موت سے کوئی مفر ہی نہیں ہے تو یہ نہایت عاجزی ہو گی کہ ہم بزدلی سے جان دیں۔

زودينا من حسن و جهك مادا ما فحسن الوجوه حال تحول
وصلينا نصلك فى هذه الدنيا فان المقام فيها قليل(٣١)

جب تک تیرے چہرے میں حسن ہے ہمیں اس حسن نے فیض پہنچاتی رہ کہ یہ حسن سدا باقی نہیں رہے گا، اور ہم سے اس دنیا میں میل جول اور راہ ورسم باقی رکھ کہ ہماری یہاں اقامت تھوڑی ہی ہے۔

**بشار بن بُرد (متوفی ۱۶۷ھ)**

**پیدائش اور زندگی کے حالات:**

بشار بن جوخ، ولاء کے اعتبار سے عقیلی ہے۔(اس لیے کہ اس کے کانوں میں بندے پڑے رہتے ہیں) اس کا باپ ایرانی، طخارستان کا باشندہ تھا جو مہلب بن ابی صفری کے قیدیوں میں سے تھا جسے مہلب نے بنی عقیل کی کسی خاتون کو ہبہ کر دیا تھا۔ اس خاتون نے بعد میں اس سے نکاح کر لیا اور یوں وہ عقیلی کہلانے لگی۔ بشار بصرہ میں پیدا ہوا اور اس نے بنی عقیل میں پرورش پائی۔ وہ بصریہ کے مضافات میں مقیم عرب کے دیہاتی باشندوں سے ربط وضبط رکھنے میں دلچسپی لیتا اور ان میں آمد ورفت کا سلسلہ رکھتا تھا چنانچہ جب وہ جوان ہوا تو اس کی زبان نہایت شستہ و فصیح تھی اور بیان غلطیوں سے پاک یہی سبب ہے کہ بشاوہ وہ آخری شاعر ہے جن کی شاعری علماء نحو قابل سند شمار کرتے ہیں جب اس نے باقاعدہ ذمہ داری کی زندگی میں قدم رکھا تو خلفاء و امراء کی مدح کہہ کر ان کے عطیوں پر گذر کرنے لگا۔ اگر وہ ہجو نہ کہتا اور عوروں سے تعرض نہ کرتا تو وہ اپنی شاعری سے نہات آسودہ و بافراغت زندگی گذارنے میں کامیاب ہو جاتا، لیکن اس کی عریاں بیانی کی وجہ سے لوگ اس سے برہم ہو گئے اور انہوں نے دو زشیز اؤں کی حرمت، پردہ نشینوں کی عصمت محفوظ رکھنے کے لیے اسے مار ڈالنا چاہا۔ مالک بن دینار کا قول ہے "اس ملحد اندھے کی شاعری سے زیادہ کوئی چیز شہر میں لوگوں کو فسق و فجور پر برانگیختہ کرنے والی نہیں ہے"۔ بالآخر غیرت مند شہریوں کے ایک وفد نے مہدی کے دربار میں پہنچ کر اسے بشار کا ایک عشقیہ قصیدہ سنایا جسے سن کر مہدی نے کہا" یہی وہ شاعری ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی اور مشکلات آسان کر دیتی ہے" پھر اس نے بشار کو بلوایا جب وہ حاضر ہوا تو اس سے کہا" اگر تم نے آج کے بعد ایک عشقیہ شعر بھی کہا تو بخدا میں تمہاری جان لوں گا"۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی بشار تغزل و تشبیب میں کچھ کہنا چاہتا تو اسے خلیفہ کی تنبیہ یاد آجاتی، تاہم وہ اسے نہ روکتی اور وہ اپنی مرضی کی شاعری کر گذرتا۔

جب اس کی عریاں بیانی حد سے بڑھ گئی، مہدی کی تنبیہ اور لوگوں کی سرزنش بھی بے سود رہی تو لوگوں نے ایک مرتبہ پھر خلیفہ کے دربار میں اس کی شکایت کی اور اس کے خلاف تمام الزامات بیان کیے۔ اس اثناء میں ایک مرتبہ بشار نے مہدی کی مدح بھی کی، لیکن مہدی اس سے بہ گشتگی کی بناء پر اسے انعام دینے کی بجائے الٹا اس پر برس پڑا۔ چنانچہ بشار نے اس کی ہجو کہہ ڈالی جس میں یہ شعر بھی تھے:

بني أمية هبوا طال نومكم ان الخليفة يعقوب بن داود

ضاعت خلافتكم يا قوم فالتمسوا خليفة الله بين الزق والعود(٣٢)

اے بنی امیہ! بہت سو چکے اب بیدار ہو جاؤ۔ واقعہ یہ ہے خلیفہ یعقوب بن داود ہے اے قوم! تمہاری خلافت ضائع ہو گئی ہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر تم خلیفہ اللہ کو تلاش کرنا چاہو گے تو اسے شراب و ستار کی محفل میں پاؤ گے۔

جب یہ ہجو تک پہنچی تو اس نے کوتوال کو بلا کر اسے بشار کو کوڑے مارنے کا حکم دیا، چنانچہ اس نے اتنے کوڑے مارے کہ بشار مر گیا۔ یہ ١٦٧ھ کا واقعہ ہے جب وہ ستر برس کا ہو رہا تھا۔

**بشار کا حلیہ اور اخلاق:**

بشار ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہوا تھا اور اس نے دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا، بایں ہمہ اپنی شاعری میں چیزوں کو ایک دوسری سے تشبیہ دینے میں جو کمال اسے حاصل تھا وہ آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں۔ مثلاً وہ اپنے ایک شعر میں جنگ میں چھا جانے والے گرد و غبار کے اندھیرے کو رات سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

كأن مثار النقع فوق رءوسنا وأسيافنا ليل تهاوى كواكبه(٣٣)

بشار بڑے ڈیل ڈول والا، نہایت لمبا، چیچک رو اور ایسی ابھری آنکھوں والا تھا جن پر سرخ گوشت چڑھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ نہایت بد شکل اور بھیانک اندھا تھا ایک مرتبہ کسی عورت نے اس سے کہا "پتہ نہیں اس مکروہ صورت کے باوجود لوگ تجھ سے مرعوب کیوں ہو جاتے ہیں؟" تو اس نے جواب دیا "شیر کا حسن لوگوں کو مرعوب نہیں کرتا ہے"۔ ایک مرتبہ ایک ادیب اس سے ملنے کے لیے اس کے گھر پر پہنچا جہاں اس نے بشار کو گھر کی دھلیز پر بھینسے کی طرح پڑا سوتا پایا، اس نے بشار سے کہا "اے ابو معافہ! یہ شعر کس کا ہے؟

إن في بردي جسما ناحلا لو توكات عليه لا تهدم

میرے کپڑوں کے اندر ایک لاغر جسم ہے، اگر تو (اے محبوبہ) اس پر ٹیک لگا لے تو وہ دھم سے گر جائے گا"۔

بشار نے جواب دیا "یہ میرا ہی شعر ہے" پھر اس نے پوچھا "اور یہ شعر کس کا ہے؟

في حلتي جسم فتنى ناحل لو هبت الريح به طاحا(٣٤)

میرے لباس میں ایک لاغر نوجوان کا جسم ہے اگر اس پر ہوا بھی چلے تو وہ اڑ جائے گا"۔ بشار نے جواب دیا" یہ بھی میرا شعر ہے "اس پر اس ادیب نے کہا" جناب کو اس مبالغہ آرائی اور دروغ بیانی کی زحمت کیوں برداشت کرنا پڑی؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ وہ تند و تیز آندھیاں بھی چلا دے جن سے پچھلی قوموں کو ہلاک کیا گیا تھا تو بخدا وہ بھی آپ کو اپنی جگہ سے ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گی"۔

بشار بڑا ذہین، حاضر جواب، حساس، بد زبان، منہ پھٹ اور مسخرا تھا، اس کی دینداری مشتبہ تھی، وہ تناسخ کا قائل تھا، آگ کو مٹی پر تفوق اور آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے بارے میں وہ ابلیس کی رائے کو صحیح بتاتا تھا، اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:

الأرض مظلمة والنار مشرقة والنار معبودة مذ كانت النار(٣٥)

زمین تاریک ہے اور آگ روشن، اور آگ جب سے پیدا ہوئی ہے وہ معبود ہی ہے۔

بشار جب اپنے شعر پڑھنا چاہتا تو پہلے تالی بجاتا، کنکھارتا اور دائیں بائیں تھوکتا پھر شعر پڑھتا۔

**شاعری:**

بیس برس کی عمر میں بشار نے شاعری شروع کر دی تھی، اور ابھی اس نے جوانی میں پوری طرح قدم بھی نہ رکھا تھا کہ ملک میں اس کا شہرہ عام ہو چکا تھا اس نے جریر کا مزہ ناہ پایا تھا اور اسکی ہجو بھی کہی تھ، خود اس کا قول ہے" میں نے جریر کی ہجو کہی، لیکن اس نے بچہ سمجھتے ہوئے مجھے دوخور اعتنا نہ سمجھا، اگر وہ میرا جواب دے دیتا تو میں بڑا شاعر بن جاتا"۔ اس نے سب سے پہلے شاعری کی جس صنف میں طبع آزمائی کی وہ ہجو ہی تھی، اس لیے کہ اس کے بچپن میں اسی صنف کلام کی مانگ تھی بعد ازاں اس نے نہ صرف شاعری کی ان تمام اصناف میں طبع آزمائی کی جو اس سے قبل موجود تھیں بلکہ ان میں اضافہ بھی کیا۔ شاعری کے جملہ رواۃ و ناقدین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ بشار رطبہ مولدین کا سر گروہ، فحش مذاق اور رق انگیز تغزل میں ان سب کا امام تھا یہی پہلا شخص ہے جس کی شاعری میں بدویانہ بھاری بھر کم پن اور تمدنی نزاکت یکجا ملتی ہے اور جس کی شاعری قدیم و جدید شاعری کے درمیان حد اوسط ہے طبقہ مولدین میں اس کا وہی مقام ہے جو شعراء جاہلین میں امرؤ القیس کا تعقید، نامانوس الفاظ، اور دیگر خامیوں سے اس کی شاعری کے پاک صاف ہونے کے باعث اصمعی اسے عشی و نابغہ کا ہم پلہ قرار دیتا تھا خود جاحظ نے تمام اصناف کلام میں اس کے تفق کی شہادت دی ہے وہ کہتا ہے "بشار خطیب تھا وہ نظم و نثر پر کامل دسترس رکھتا تھا وہ طبع زاد اور جدت طراز شاعر، اور شاعری کے تمام اصناف میں ماہر اور ہر صنف پر طبع آزمائی کرنے والا تھا"۔

بشار کی شاعری میں جو روانی و کشش اور حسن و رونق ہے اس کی بناء پر وہ بصری کے جوانوں اور آزاد مزاجوں میں خوب مقبول ہوئی خود عورتوں پر بھی اس کا جادو چل گیا، چنانچہ وہ بھی بشار کے پاس جاتیں، اس کی باتوں سے دل خوش کرتیں اور اس کے اشعار گاتیں، ان میں سے بعدہ نامی ایک کنیز پر وہ عاشق ہو گیا تھا اور اسے اپنی شاعری میں نام لے لے کر مشہور بھی کر دیا تھا چنانچہ ان دونوں کے متعلق بہت سے قصے اور اشعار لوگوں میں عام ہو چکے تھے۔

**شاعری کے عیوب:**

اس کی شاعری میں سے قابل تنقید مواد بتام و کمال معلوم کرنا ممکن نہیں اس لیے کہ اس کا بیشتر حصہ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو گیا بارہ ہزار قصائد میں سے صرف گنتی کے منتخب قطعات مختلف کتابوں میں منتشر باقی رہ گئے ہیں بہر حال اس کے عیوب معلوم ہو سکے ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ وہ دل لگی بازی اور مذاق میں حد سے آگے نکل جاتا ہے، ثانیا قافیہ سے مجبور ہو کر وہ بے حقیقت الفاظ سے جگہ پر کر لیتا ہے ثالثاوہ پر شوکت الفاظ اور سنجیدہ معانی سے گر کر سطحی معانی اور رکیک الفاظ پر اتر اتا ہے مثلاوہ اپنی محبوبہ کے لیے کہتا ہے:

ربابة ربة البيت تصب الخل فی الزيت

لها عشر دجاجات وديك حسن الصوت(٣٦)

ربابہ گھر کی مالکہ ہے وہ زیتون کے تیل میں سرکہ ڈالتی ہے اس کی دس مرغیاں ہیں، اور ایک خوش آواز مرغ ہے۔

یامثلااس کے یہ اشعار ہیں:

إن سلمى خلقت من قصب قصب السكر لا عظم الجمل

وإذا أدنيت منها بصلا غلب المسك على ريح البصل(٣٧)

سلمٰی، شکر سے بنی ہے، اونٹ کی ہڈی سے نہیں، اگر تم اس کے پاس پیاز لے جاؤ تو اس کی مشک سے بسی ہوئی مہک پیاز کی لہر پر غالب آجائے گی۔

لیکن بشار معذرت کرتے ہوئے کہتا تھا کہ پہلی قسم کی شاعری حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کی گئی ہے اور مؤخر الذکر قسم کی شاعری بچپن کی یادگار ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ: عشقیہ شاعری:

يزهدني في حب عبدة عشر قلوبهم فيها مخالفة قلبي

نقلت دعوا قلبي وما اختار وارتضى فبالقلب لا بالعين يبصر ذوالحب(٣٨)

بہت سے لوگ جن کے دل میرے دل سے ہم آہنگ نہیں میرے دل سے عبدہ کی محبت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ تم میرے دل کو اس کی مرضی اور اختیار میں آزاد چھوڑ دو اس لیے کہ عاشق دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔

يا قوم أذني لبعض الحي عاشقة والأذن تعشق قبل العين احيانا

قالو بمن لا ترى تهذي؟ فقلت لهم الأذن كالعين توفى القلب ما كانا(٣٩)

اے لوگو! محلہ کے کسی فرد پر میرا کان عاشق ہو گیا ہے، اور کبھی آنکھ سے پہلے کان عاشق ہو جاتا ہے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ جسے تم نے دیکھا بھی نہیں اس کے بارے میں بے تکی ہانکتے ہو؟ اور میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ کان بھی آنکھ کی طرح دل کو حقیقت حال سے پوری طرح باخبر کر دیتا ہے۔

اس کے مشہور اشعار:

هل تعلمين وراء الحب منزلة تدني إليك فإن الحب أقصاني(٤٠)

کیا محبت سے آگے بھی کوئی ایسا مقام ہے جس پر پہنچ کر میں تجھ سے قریب ہو سکوں گا؟ اس محبت نے تو مجھے تجھ سے اور دور ہی کر دیا ہے۔

اس کے ان شعروں سے عقیدہ جبر کی تائید ہوتی ہے:

خلقت على ما في غير مخير هواي، ولو خيرت كنت المهذبا

أريد فل أعطى وأعطى فلم أرد وقصر علمي أن أنال المغيبا(٤١)

میں جن اخلاق و اعادات پر پیدا ہوا ہوں وہ اختیاری نہیں جنہیں میں نے اپنی مرضی سے پسند کیا ہو، اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو میں نہایت شائستہ ہوتا۔ جو میں چاہتا ہوں وہ مجھے دیا نہیں جاتا، اور جو کچھ مجھے دیا جاتا ہے اسے میں چاہتا نہیں۔ اور میرا علم، غیب کے امور کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔

وصف و حماسہ کا نمونہ:

| | |
|---|---|
| إذا الملك الجبار سغر خده | مشيا اليه بالسيوف نعاتبه |
| وارعن يغشى الشمس لون حديده | وتجسس أبصار الكماة كتائبه |
| تغص به الأرض الفضاء إذا غذا | تزاحم أركان الجبال مناكبه |
| ركبنا له جهرا بكل مثقف | وابيض تستسقى الدماء منشاربه |
| كان مثار النقع فوق رؤوسنا | واسيا فنا ليل تهاوى كواكبه(٤٢) |

جب کوئی جبار بادشاہ اکڑتا ہے تو ہم اس کے عتاب کو فر کرنے کے لیے تلواریں لے کر اس کے مقابلہ میں آجاتے ہیں اور وہ ہتھیار سے لیس لشکر جرار جس کے نیزوں اور آہنی ہتھیاروں سے سورج چھپ جاتا ہے اور جس کے فوجی دستے بہادروں کی نگاہوں کو روک لیتے ہیں وسیع زمین جس کی کثرت سے تنگ ہو جاتی ہے اور جب وہ حرکت میں آتا ہے تو اس کے کنارے پہاڑوں سے مزاحمت کرتے ہیں، ہم ایسے لشکر جرار کے مقابلہ میں خون آشام نیزے اور تلواریں لے کر چڑھ آتے ہیں۔ اس جنگ میں ہمارے سروں پر چھانے والا غبار اور ہماری تلواریں ایسا سماں پیدا کرتی ہیں جیسے رات (کی تاریکی) میں تارے ٹوٹ رہے ہوں۔

**حاصل بحث:**

شعر کا ذوق اور شاعری کا فن، انسان کے دوسرے وجودی سرمایوں کے مانند، اس صورت میں قابل قدر ہے، جب اس سے صحیح، مثبت اور تعمیری استفادہ کیا جائے- لیکن اگر اس فن سے معاشرہ کے اعتقادات اور اخلاق کو تباہ برباد کرنے اور فساد و بے راہ روی کی ہمت افزائی کے ایک تخریب کارانہ وسیلہ کے عنوان سے استفادہ کیا جائے اور انسانوں کو بیہودگی کی طرف دھکیل دے، یا صرف ایک بے معنی سرگرمی شمار کیا جائے، تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ نقصان دہ بھی ہے- پس شعر ایک وسیلہ ہے اور اس کی قدر و قیمت کا معیار وہ مقصد ہے، جس کے لئے شعر سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

افسوس کہ دنیا کی اقوام اور ملتوں کی پوری تاریخ میں، شعر سے کافی حد تک ناجائز استفادہ کیا گیا ہے، اور اس لطیف ذوق کو آلودہ ماحول کا اس قدر شکار بنایا گیا ہے کہ بعض اوقات یہ فساد و تباہی کا موثر ترین وسیلہ بن گیا ہے، خصوصاً عصر جہالت میں، جو عرب قوم کا فکری و اخلاقی پستی کا دور تھا، "شعر"، "شراب"، اور "غارت" ہمیشہ باہم ہوا کرتے تھے، لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے کہ پوری تاریخ میں تعمیری اور با مقصد اشعار نے

نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں اور کبھی ایک قوم وملت کو خونخوار اور ظالم دشمنوں کے مقابلے ایسے شجاعانہ طور پر صف آرا کیا ہے کہ انھوں نے کسی قسم کی پرواہ کئے بغیر دشمن کی صفوں پر یلغار کر کے انھیں تہس نہس کر دیا۔

## حوالہ جات


١۔ مبارک، زکی، الملائح النبویہ فی الادب العربی، ص٢٣/٦

٢۔ سورۃ یسین آیۃ:٦٩

٣۔ سورۃ الحاقہ آیات:٤٠-٤١

٤۔ الدینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، ابو محمد، الشعر والشعراء، ناشر:دار حدیث، قاہرۃ، ١٤٢٣ھ، عدد الأجزاء:٢، ١/٢٧١

٥۔ میدانی، نیساپوری، احمد بن محمد، ابوالفضل، مجمع الامثال، دار العلم بیروت، ٢٠٠٢م، ٢/٤٧۔

٦۔ زرکلی، محمود بن محمد، خیر الدین، الاعلام، دار فکر بیروت، ٢٠٠٤م، ١٨/١٣٥۔

٧۔ الاصفہانی، ابوالفرج، الاغانی، دار فکر بیروت، ١٩٨٢، ١٨/١٣٤۔

٨۔ ایضًا

٩۔ سعدی، تمیمی، سلیک بن عمیر، دیوان سلیک، ادب عربی، ترکی، ٢٠١٥، ص/٥

١٠۔ ایضًا

١١۔ الاصفہانی، الاغانی، ٢١/٢٧٧.

١٢۔ ابوالفرج، محمد بن اسحاق، ابن ندیم، الفہرست، دار معرفہ بیروت، ١٩٧٨، ص/٧٨.

١٣۔ الاصفہانی، الاغانی، ٢١/٢٨٨۔

١٤۔ قیروانی، ابن رشیق، ابو علی، العمدۃ، دار جیل، ١٩٨١، ١/١٩٣

١٥۔ الاصفہانی، الاغانی، ٢١/٢٨٧۔

١٦۔ عکبری، ابوالبقاء، متنبی، احمد بن حسین ابوطیب، شرح دیوان متنبی، دار کتب علمیہ بیروت، ص٣٥٠

١٧۔ ایضًا، ص٢٥٤

۱۸۔ ایضًا، ص۲۹٦

۱۹۔ ایضًا، ص۴۵۲

۲۰۔ ایضًا، ص۴٦٦

۲۱۔ ایضًا، ص۴۷۸

۲۲۔ ایضًا، ص۵۷۴

۲۳۔ ایضًا، ص۳۳۹

۲۴۔ دیوان متنبی

۲۵۔ ایضًا،

۲٦۔ ایضًا،

۲۷۔ ایضًا،

۲۸۔ ایضًا،

۲۹۔ ایضًا،

۳۰۔ ایضًا،

۳۱۔ ایضًا،

۳۲۔ برد، بن بشار، دیوان بشار بن برد، جمع و تحقیق و شرح: محمد الطاہر بن عاشور، جزءاول، ص ٦۲۴

۳۳۔ ایضًا، جزءاول، ص ۲۰۲

۳۴۔ ایضًا، جزءاول، ص ۴۲۵

۳۵۔ ایضًا، جزءاول، ص ۸۸۲

۳٦۔ ایضًا، جزءاول، ص ۳۵۳

۳۷۔ ایضًا، جزءاول، ص۹٦۹

۳۸۔ ایضًا، جزءاول، ص۲٦۸

۳۹۔ ایضًا، جزءاول، ص۱۰۵۷

۴۰۔ ایضًا، جزءاول، ص۱۰۸۳

۴۱۔ ایضًا، جزءاول، ص۱۴۳

۴۲۔ ایضًا، جزءاول، ص۲۰۲

ڈاکٹر نقیب احمد جانؔ
استاد شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی، صوابی
ڈاکٹر منزہ مبین
صدرِ شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی، صوابی

# ٹالسٹائی کی منتخب کہانیوں میں فکری سطح پر معاصر روسی تمدن کی بازیافت

## Glimpses of the contemporary Russian Culture Ideality in Short Stories of Talistae.

Literature reflects life. Every writer is affected directly or indirectly by his/her culture, surroundings, contemporary traditions and social norms which reflect in his/her creative writings. Storytelling and story writing remained an art from the pre-historic era and with the passage of time the interest of human beings in story has not vanished rather it has augmented and has taken different shapes and forms. Story is the innate need and interest of mankind and they love to hear stories since their early days. Short story is a form of literature which appeals to this very aesthetic sense. With the gradual development of literature, the art of the story writing got much refined and it is no more an art of narration rather it has adopted a full fledge form of practice in art and literature. The modern story writers develop thematic writings for wellbeing of the society.

**Key Words:** *Talistae, Short Story, Russia, Culture, Translations.*

ادب زندگی کا ترجمان اور ادیب معاشرے کا شاہد و ناقد ہوتا ہے۔ ہر ادیب کی تخلیقات میں اس کے معاصر تہذیب و تمدن اور معاشرت کا عکس نظر آتا ہے۔ کہانی کار افسانوی انداز میں اپنے معاصر معاشرے اور تمدن کے عکس کو اپنے قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ تخیل کی آمیزش سے حقیقت کو قاری کے ذوقِ نظر کے مطابق ڈھال کر اسے اس کے لیے قابلِ مطالعہ بناتا ہے اور نہایت چابک دستی سے اس میں اپنی رائے سمو کر قاری کو اپنا ہمنوا بنانے کی سعی کرتا ہے۔ جو ادیب اپنی اس سعی میں کامیاب ٹھہرتا ہے اس کی تخلیقات کلاسیک کا درجہ پالیتی ہیں۔ نہ صرف یہ

کہ وہ اپنے معاصر تہذیب و تمدن کا خاکہ پیش کرتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آنے والے ادوار میں بھی اسی طرح کی اہمیت و افادیت کی حامل ٹھہرتی ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہیں۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ روس کے چار مشہور ادیبوں گوگول، ترگنیف، دوستوفسکی، ٹالسٹائی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مختصر کہانیوں سے کیا اور اس صنف میں انہوں نے بیش بہا اضافے بھی کیے۔ ٹالسٹائی صرف روس ہی نہیں بلکہ عالمی ادبیات میں اپنی تخلیقات اور تنقیدی نظریات کی بدولت امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے افسانے اور ناول بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور آج تک ان کی مقبولیت میں فرق نہیں پڑا ہے۔ ٹالسٹائی ایسے فن کو پسند کرتا تھا جو انسان دوستی، محبت، ایثار اور دیگر اخلاقی خصوصیات کا ترجمان ہو کیونکہ اخلاقی قواعد و ضوابط کی عملی ضرورت خواہشات کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصادم نہ صرف فرد بلکہ مختلف افراد و اقوام میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ٹالسٹائی اپنی ادبی زندگی کے آخری زمانے تک کہانیاں لکھتا رہا لیکن ابتدائی دور کی کہانیوں اور خاکوں کی خاص اہمیت ہے۔ اس تاثراتی دور سے گزر جانے کے بعد زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں اور حیات و کائنات کے مسائل پر غور و فکر سے اس کے ادبی نظریات بدلنے لگے۔ بقول ڈاکٹر محمد یسین "عالمی ادب کے صف اول کے تخلیقی فنکاروں میں ٹالسٹائی کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کا شمار سرزمین روس کے ان مایہ ناز مشاہیر میں کیا جاتا ہے جنہوں نے صنف افسانہ کو معراج کمال تک پہنچایا ہے۔"[1] ٹالسٹائی کی ادبی زندگی میں ذہنی جودت اور تخلیقی اپج کے علاوہ مشاہدے اور مطالعے کا خاص حصہ ہے۔ بچپن ہی سے اسے روسی عوامی کہانیوں اور انجیل کے قصوں سے خاص دلچسپی تھی۔ علاوہ ازیں وہ پریوں کی کہانیوں اور الف لیلہ و داستان امیر حمزہ قسم کی کہانیوں سے بھی اثرات قبول کرتا رہا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں ٹالسٹائی کی منتخب کہانیوں میں فکری سطح پر معاصر روسی تمدن کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۸۵۹ء میں "گھریلو مسرت" کے عنوان کے تحت ایک کہانی لکھی۔ یہ ایک رومانوی کہانی ہے جس میں عورت کی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی کی مرکزی کردار ماشا جس کا اصل نام " ماریا الیکساندورنا" ہوتا ہے اپنی والدہ کی اچانک وفات کے بعد زندگی سے بہت مایوس ہو جاتی ہے۔ اس کی والدہ نے وعدہ کیا تھا کہ جب ماشا اٹھارہ سال کی ہو جائے گی تو وہ شہر جائیں گے۔ یوں والدہ کی اچانک وفات کے بعد اس کے شہر جانے ،رنگا رنگی اور بڑی سوسائٹی میں گھومنے پھرنے کے خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ماشا اپنی اتالیق

کاتیا کے ساتھ مل کر چھوٹی بہن سونیا کی نگہداشت و دیکھ بھال میں منہمک ہونے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ماشا کی نفسیاتی صورتحال کا بعنیہ اندازہ زیر نظر اقتباس سے ہو جاتا ہے۔

> مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تمام عمر خدائی کے پچھواڑے اسی گاؤں میں پڑی سڑا کروں گی اور اسی بے اُمید اکتاہٹ اور افسردگی کے عالم میں زندگی گزار دوں گی جس سے نکلنے کی نہ تو مجھ میں طاقت۔۔۔۔[۲]

ماشا کی زندگی میں تغیر و تبدل اس دن آتا ہے جب اس کے والد کے قریبی دوست ''سرگئی میخالووچ '' تین سال بعد ان کے گھر آتے ہیں اور ان کی صحبت سے ماشا کی زندگی میں رنگ بھرنے لگتے ہیں۔ماشا کو سرگئی میخالووچ سے محبت ہو جاتی ہے اور مشرقی لڑکیوں کی طرح اظہار محبت میں ہچکچاتی ہے۔دوسری جانب سرگئی میخالووچ بھی ماشا کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن عمروں کے وسیع تفاوت کی بناء پر اظہار میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں اور ماشا سے دور جانے کی ٹھان لیتے ہیں۔ایسی صورتحال میں ماشا کے اظہار محبت سے وہ حیران رہ جاتے ہیں اور دونوں ہنسی خوشی ازدواجی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔سرگئی میخالووچ ایک زیرک اور سمجھ دار انسان ہوتے ہیں اسی لئے انہوں نے اپنے تعلق میں کبھی زور زبردستی کو حاوی نہیں ہونے دیا۔وہ ماشا کی خواہشات کا بہت احترام کرتے ہوئے اسے شہری زندگی کی رنگینوں میں لے جاتے ہیں اور سرگئی میخالووچ یہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ مصنوعی پن انسان کی حقیقی خوشیاں چھین لیتا ہے۔ماشا جب اس سوسائٹی کا حصہ بننے لگتی ہے تو سرگئی میخالووچ بہت اداس ہو جاتے ہیں۔ٹالسٹائی نے یہاں رشک و حسد جیسے بنیادی جذبے کا ذکر کیا ہے جو مشرق و مغرب میں یکساں پایا جاتا ہے۔سرگئی میخالووچ اپنی بیوی کو غیر مردوں کی ہوس بھری نظروں سے بچانا چاہتا تھا۔جب وہ باز نہ آئی تو انہوں نے ماشا کو آزادی دی کہ وہ اپنے تجربات کی بنیاد پر جو سیکھے گی وہ صرف کہی سنی باتوں سے نہیں سیکھ پائے گی۔مثلاوہ ایک مقام پر کہتے ہیں کہ:

> ہم سب اور خاص طور پر تم عورتوں کے لئے زندگی کا اصلی روپ دیکھنے کے لئے پہلے زندگی کے سطحی پہلو سے آشنا ہونا ضروری ہے۔اور ہم میں سے کوئی بھی دوسروں کے تجربوں سے فیض نہیں اٹھا سکتا۔[۳]

اس کہانی ''گھریلو مسرت'' میں گھریلو مسائل پر قلم اٹھایا گیا ہے کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر انسان غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔اور ساری زندگی اسکا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔سب سے اہم بات افہام و تفہیم ہوتی ہے کوئی بھی بات ہو کوئی بھی معاملہ ہو لیکن متعلقہ فرد کے ساتھ بات کرنے کے بجائے اگر اپنے ذہن میں جو بات آجاتی ہے

اس کو بنیاد بنا کر انسان غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس سے گھر کے گھر برباد ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی غلط فہمی ہونے کی صورت میں اس کو خوش اسلوبی سے رفع کرنے کا واحد راستہ افہام و تفہیم ہے۔ اس کے علاوہ محبت کے مختلف مدارج پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ہر عہد کی محبت الگ الگ ہوتی ہے جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اس طرح اس جذبے میں بھی تغیرات آتے رہتے ہیں۔ جوانی کی محبت میں جوش و خروش اور جذبات کا بے ہنگم زور ہوتا ہے۔ ادھیڑ عمری کی محبت میں ایک رکھ رکھاؤ آجاتا ہے۔ بچپن کی محبتیں خالص اور معصوم ہوتی ہیں۔ اس طرح بچپن میں خیالات ناپختہ اور جوانی میں جوش اور جذبے سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ادھیڑ عمری میں خیالات میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور سلیقہ آجاتا ہے اور پھر بڑھاپے کی دہلیز پر خیالات میں دانشمندی اور سوچ و بچار کا عنصر بھی آجاتا ہے۔ اس کہانی گھریلو محبت میں انہوں نے ان انسانی جذبوں کے حوالے سے اپنے خیالات و احساسات کو فکشن کے لبادے میں پیش کیا ہے۔

روس کے سیاسی و تہذیبی طرز فکر کی نمائندہ ٹالسٹائی کی ایک اور کہانی ''گھوڑے کی آپ بیتی'' ہے جو اس نے ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ لکھنی شروع کی اور ۱۸۸۵ء میں ختم ہوئی۔ اس کہانی کا مرکزی خیال ایک اور روسی مصنف ''استاخوچ'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس نے گھوڑوں کے متعلق دو مقبول کہانیاں لکھیں اور ٹالسٹائی نے ادبی اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوتے ہوئے ان کا پورا حوالہ بھی دیا ہے۔ زیر نظر کہانی کے مرکزی کردار ''ابلق گھوڑا'' سرنگ گھوڑی'' اور ''نیستر'' (گلہ بان) ہیں۔ کہانی کا مرکز و محور ابلق کی زندگی کا نشیب و فراز ہے۔ اس اتار چڑھاؤ کی بناء پر نامناسب حالات و واقعات، مظالم، تلخ رویے جو خرید و فروخت کی وجہ سے ابلق نے سہے وہ تاحیات اس کے دل پر آبلے کی مانند رہے تھے۔ ابلق کو ٹالسٹائی نے ظلم و ستم کے استعارہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ جب ابلق بوڑھا ہوتا ہے تو اس کو دیگر ساتھی مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اور اسی سبب وہ سب سے الگ تھلگ رہنے لگتا ہے۔ مثلا

> بڑھاپا بعض دفعہ بہت شاندار ہوتا ہے 'بعض اوقات گھناؤنا اور بعض مرتبہ قابل رحم۔
> اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ شاندار اور گھناؤنا دونوں ہی ہو۔ اس ابلق گھوڑے کا
> بڑھاپا اسی نوعیت کا تھا۔''(۴)

اس آپ بیتی میں روس کے سیاسی حالات کا بخوبی عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ گھوڑے کی زبانی ٹالسٹائی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ روسی عوام کے جذبات کا اظہار ہے جہاں انقلاب سے قبل عام انسان کی یہی زندگی تھی۔ یہ اس معاشرے کی نحیف سی آواز ہے جو انسانیت کے اوج کمال پر ہونے کے بجائے اس کے مادیت پسند ہونے پر

دلالت کرتی ہے۔ یہ دنیا بہت ظالم ہے اور مادیت پرستانہ ذہنیت کی حامل نسلوں میں انسانی جذبات و احساسات کا فقدان ہو گیا ہے۔ مادہ پرستوں کا دین ایمان اپنا فائدہ اور اپنے مفاد ہوتے ہیں۔ جب تک انہیں کسی فرد میں اپنے مفاد اور فائدے کا پہلو نظر آتا ہے اس کی قدر و تعظیم کرتے ہیں۔ جب انہیں یقین ہوتا ہے کہ اب یہ اس قابل نہیں رہا کہ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے یا پھر وہ ان کے مفاد کے لیے کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا تو نہ صرف یہ کہ اس کی قدر و منزلت ختم ہو جاتی ہے بلکہ اس کو تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات کے تناظر میں روسی معاشرے میں پوری دنیا کے تمام اقوام کی سوچ کے مصداق روسی معاشرے میں جو سوچ پنپ رہی تھی نہایت دل نشین انداز میں اس کہانی میں ٹالسٹائی نے اس کو موضوع بنایا ہے۔

اسی طرح ان کی ایک اور معروف کہانی ''کریتزر سوناٹا'' جو کہ روسی معاشرت کی عکاس سمجھی جاتی ہے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کی ابتداء ٹرین سے ہوتی ہے جس میں راوی سوار ہوتا ہے اور تمام کہانی راوی بیان کرتا ہے۔ کہانی کی ابتدا یعنی سرورق پر مصنف نے لکھا ہے کہ ''لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو کسی عورت کو بری نظر سے دیکھتا ہے، دل ہی دل میں اس کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوتا ہے۔'' اس کہانی میں روسی اور یورپی معاشرے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے مثلاً دوران سفر ٹرین میں جو موضوعات بیان کیے گئے ہیں ان میں جدید تعلیم کے فوائد و نقصانات، مغرب میں ازدواجی زندگی کی خرابیاں، عورتوں کی سماجی حیثیت و حقوق پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ زیر نظر افسانہ میں جابجا ایسے بیانات دیے گئے جن سے مغربی طرز معاشرت کی اور اس کی خرابیوں کے بموجب پیدا ہونے والے حالات کی جھلک واضح نظر آتی ہے مثلاً ایک مقام پر طلاق کے متعلق لکھا ہے کہ:

> طلاق کا مسئلہ یورپ میں لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور روس میں طلاق روزافزوں عام ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ کیونکہ شروع ہی سے عورتوں کو ڈھیل دینا ٹھیک نہیں ہے۔ چراہ گاہ میں گھوڑے پر اور گھر میں عورت پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ ہاں، ہاں صنف نازک کو شروع ہی سے کس کر رکھنے کی ضرورت ہے ورنہ سب کچھ چوپٹ ہو جاتا ہے۔''(۵)

طلاق ناپسندیدہ کاموں میں سے ایک تصور ہوتا تھا لیکن جدید دور میں اس کو اتنا قابل نفرت نہیں سمجھا جاتا۔ پھر بھی اس کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ جب تک بیوی کو چاہا پاس رکھا اور جب دل بھر گیا تو طلاق دے دی۔ اس تناظر میں دیکھیں تو طلاق عورت کے حوالے سے انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ لیکن بیوی کو طلاق نہ دے کر اس کا

استحصال کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر بیوی ایک مفید گھریلو جانور بن کر رہ جاتی ہے۔ کہ اس کو محبت اور توجہ تو نہیں ملتی لیکن طلاق دے کر اسے آزاد بھی نہیں کیا جاتا کہ جہاں چاہے زندگی گزارے۔ اس طرح کے استحصال سے بہتر ہے طلاق ہی دی جائے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو عورتوں کی آزادی نے کئی حوالوں سے شادی کے لئے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ پھر آزادی کے پس منظر میں پیدا ہونے والی ان مشکلات کے لیے تعلیم اور روشن خیالی کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں تعلیم اور بالخصوص عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے ٹرین میں سفر کرنے والے بزرگ نے اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا کہ:

> آج کل لوگ ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں۔۔۔۔ تعلیم سے حماقت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ عورتوں کی تعلیم ہمیشہ اسی رویے کے مطابق ہو گی جو مردوں کا ان کی طرف ہے۔ (٦)

روایتی اخلاق کے احیا کے لئے یہ لازم ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم ایسی ہو کہ جو انہیں احمق، توہم پرست اور جاہل بنا سکے۔ عورت کو مرد نے ہمیشہ سے اپنا محکوم تصور کیا ہے اور وہ اس کو اپنے اختیار میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے لازم ہے کہ عورت کو جاہل رکھا جائے کیونکہ تعلیم روشنی ہے اس سے انسان کو اپنے حقوق کا شعور آجاتا ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کی جرأت پالیتا ہے۔ جب کہ پدرسری معاشرے میں مرد کبھی یہ نہیں چاہتا کہ عورت اس کے برابر کھڑا ہو کے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرے۔ اس وجہ سے ہمیشہ عورتوں کو ان پڑھ، جاہل اور اس کے نتیجے میں توہم پرست رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس طرح ان میں وہ جرأت نہیں پنپتی کہ مردوں کے مقابل کھڑی ہو سکیں۔ ٹالسٹائی عورتوں کی اس مرد ساختہ سماجی حیثیت کے متعلق ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

> عورت کی غلامی اس چیز میں مضمر ہے کہ مردوں کو اسے اپنے حظ نفس کی خاطر استعمال کرنے کی خواہش ہے اور وہ اسے جائز اور اچھی بات سمجھتے ہیں۔ سو ہوتا یہ ہے کہ وہ عورت کو آزادی عطا کرتے ہیں 'اسے مردوں کے برابر حقوق دیتے ہیں' مگر سمجھتے اسے وسیلہ تفریح ہی ہیں۔ وہ بچپن ہی سے اسے یہ تربیت دیتے ہیں اور رائے عامہ کے ذریعے بھی یہی سکھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عورت اب بھی اس طرح پنجے، ذلیل اور شہوت پرست غلام ہے اور مرد اسی طرح شہوت پرست اور بدکار آقا۔" (٧)

ٹالسٹائی اگرچہ نسائی ادیب نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان کے ہاں عورتوں کی زندگی سے جڑے مسائل کا بیان موثر انداز میں ملتا ہے۔ان کے افسانوں میں ایسی عورتوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن سے سماج نفرت کرتا ہے۔انہوں نے عورت کے مختلف روپ کی عکاسی متضاد اور مختلف زاویوں سے کی ہے۔عام طور پر مرد عورت کو اپنا محکوم، تابع اور حقیر و کمزور سمجھ کر اس کا حق چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔اور اسی وجہ سے عورت نفسیاتی، جنسی، عقلی، طبقاتی اور نسلی بنیادوں پر استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہے۔مرد کے ذہن میں جو عورت کا تصور و تصویر ہے وہ اس کو اسی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے۔جب کے درحقیقت دونوں جنسوں کے درمیان سوائے جسمانی ساخت کے سب صلاحیتیں اوراوصاف مساوی ہیں۔اس صورتحال کو تانیثیت کی تحریک نے تقویت بخشی۔اس حوالے سے عتیق اللہ لکھتے ہیں کہ "تانیثیت کا موقف اس عورت کو Deconstruct کرنا ہے۔جو اپنی ذات ہی سے بے خبر نہیں تھی بلکہ اس سماجی تہذیبی منظر نامے سے بھی نابلد تھی جس کے جبر نے اسے مجہول حقیقت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔"۸ایسی کہانیوں کو پڑھ کر کراہت و ناگواریت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائی نے شعوری طور پر ایسا انداز اختیار کیا ہے۔

اسی طرح ۱۹۰۳ء میں "رقص کے بعد" ٹالسٹائی کی ایک ایسی شاندار کہانی ہے جس میں نہ صرف روس بلکہ تمام مغربی عسکری طاقتوں کے پس منظر و پیش منظر کا واضح عکس ملتا ہے۔کیسے فوج میں سپاہیوں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں اور صفوں کے درمیان ہنکا کر پیٹا جاتا ہے۔ٹالسٹائی ہر قسم کی جنگ کی مذمت کرتا ہے جس میں فساد و انتشار برپا ہو۔اس کہانی کا موضوع خیر و شر کے درمیان کشمکش کا بیان ہے۔اچھائی اور برائی کے درمیان یہ کشمکش روزِ ازل سے ہی جاری ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے اسی کشمکش کا عمل دخل یہاں پر رہے گا۔اچھائی اور برائی کا تصور ہر جگہ الگ الگ ہوتا ہے۔ہر کوئی اپنی سمجھ بوجھ اور سوچ کے مطابق اچھائی برائی کی تعریف کرتا ہے۔کسی کے ہاں یہ اوصاف فطری اور پیدائشی ہوتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ نہیں یہ پیدائشی اوصاف نہیں بلکہ ماحول انسان کو اچھا یا برا بنا دیتا ہے یعنی ہر انسان اپنے ماحول، تربیت اور صحبت کی اثر سے اچھا یا برا بنتا ہے۔اس خیال کو کہ کیا کوئی انسان پیدائشی اچھا یا برا ہوتا ہے یا پھر ماحول و تربیت کا اثر اسے اچھا یا برا بناتا ہے ایک شخص "ایوان واسی لئیووچ" نے اپنی داستان سنا کر بیان کیا تھا۔

> کسی تاتاری کو بھاگنے کی سزا دے رہے ہیں۔۔۔۔یہ ایک آدمی تھا جو کمر تک ننگا تھا۔قیدی کا پورا جسم تشنجی انداز سے پھڑک رہا تھا۔ہر وار پر قیدی اپنا دکھ اور کرب

سے بگڑا ہوا چہرہ اسی طرف اٹھاتا تھا جدھر سے وار ہوتا تھا' گویا زبان حال سے اظہار حیرت کر رہا ہو۔۔۔۔وار خالی گیا؟ اچھا میں تجھے مزا چکھاتا ہوں!۔۔۔۔کرنل کی غضبناک آواز سنی۔لے اور لے!" اس کمزور اور منحنی سے سپاہی کے منہ پر زور کے کئی تھپڑ رسید کیے کیونکہ اس سپاہی کا ڈنڈا تاتاری کی سرخ کمر پر کافی سختی سے نہیں پڑا تھا۔۔۔نیا ڈنڈا لاؤ!' کرنل نے حکم دیا۔۔۔۔(٩)

متذکرہ بالا اقتباس ماضی کی ساحرانہ قوت کے بھید بھاؤ جیسا ہے کہ اس کی ساکن اور خاموش تصویروں کی دلکشی خزاں کے آخری ایام جیسی ہیں۔ماضی بدلتا ہے اور نہ ہی مقابلہ کرتا ہے۔اس کی لہریں زندگی کی بے معنی چیزوں کو بہا کر لے جاتی ہیں۔ہاں جو حسین اور ابدی یادیں ہوں وہ چمکتے ستاروں کی مانند باقی رہ جاتی ہیں۔"رقص کے بعد" کا موضوع ایوان واسی لئیوچ اور اس کی محبوبہ وارنکا کی محبت کی داستان ہے کیونکور نر کی طرف سے ایک محفل رقص منعقد کی جاتی ہے۔ہر شخص "وارنکا" کی خوبصورت شخصیت کی داد دیتے تھکتا نہیں تھا۔ایوان واسی نے بتایا کہ وہ اور وارنکا دونوں رقص کرنے میں مگن تھے اور دنیا سے بے خبر ایک دوسرے کی چاہت میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے کہ گویا ہوا میں اڑ رہے ہوں۔سامعین میں سے ایک لڑکے نے جملہ کسا کہ یہ ناممکن ہے کہ آپ دونوں کو جسموں کی ہوش نہ ہو اور تخیل میں کھو گئے ہوں تو ایوان اس کی بات کا جواب کچھ اس طرح سے دیتا ہے کہ:

یہ بات تم نئی پود کے نوجوانوں پر صادق آتی ہے۔تم لوگوں کو جسم کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ہمارے زمانے میں یہ بات نہیں تھی۔مجھے جس لڑکی سے جتنی زیادہ گہری محبت ہوتی تھی میرے نزدیک وہ اتنی ہی زیادہ آسمانی مخلوق بن جاتی تھی۔تم لوگوں کو بس ٹانگوں اور پنڈلیوں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کا احساس ہے' تم تو تخیل میں اپنی محبوباؤں کے جسم کے کپڑے اتار ڈالتے ہو۔ہم لوگ تو حضرت نوح کے نیک بیٹے کی طرح عریانی کو نمایاں کرنے کے بجائے اس کی پردہ پوشی کی کوشش کرتے تھے لیکن تم بھلا یہ بات کیسے سمجھ سکتے ہو!(١٠)

ٹالسٹائی کی کہانی "دوگسار" ١٨٥٦ء میں منظر عام پر آئی جو کہ بہت عمدہ کہانی ہے۔اس میں روس کے ماحول کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔یہ کہانی ٹالسٹائی نے انیسویں صدی میں تحریر کی جو کہ در حقیقت بیسویں صدی کی بہترین ترجمان ہے۔یہ "کاؤنٹ توربین" نامی شخص کی کہانی ہے جو متضاد شخصیت کا مالک ہے۔حالات و واقعات

کے مطابق اس کے رویے میں بدلاؤ ایسے نمایاں نظر آتے ہیں کہ گویا وہ اس کی شخصیت کا خاصہ ہیں۔کاؤنٹ ماحول کے مناسبت سے اپنا رویہ ایسے تبدیل کرلیتا ہے کہ لوگ اس کے متعلق حتمی رائے دینے سے قاصر ہیں۔کہیں وہ ظالم ہے تو کہیں وہ مظلوم، کہیں اس کے جیسا رحمدل انسان نہیں، کہیں اس جیسا سنگ دل نظر نہیں آتا ہے۔ٹالسٹائی کے کرداروں کے حوالے سے ظ۔انصاری کے ایک بیان کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ ''ٹالسٹائی اور پریم چند کے ہیرو کا قلب ماہیت (ہروے پری ور تن) ہو جاتا ہے اور وہ شر سے ایکدم خیر کا مجسمہ بن جاتے ہیں۔حالات کی تبدیلی کے ساتھ خود کو بعض اوقات بدل لیتے ہیں اور بعض اوقات نہیں۔''[11] ٹالسٹائی نے اس میں ایک ایسے شخص کی نفسیات کو موضوع بنایا ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر کسی بھی حد تک جانے میں عار محسوس نہیں کرتا ہے۔دوسری جانب مصنف نے محبت کے جذبے کی بھی اہمیت اجاگر کی ہے کہ کس طرح ادھوری محبت اپنا اثر دکھاتی ہے۔کاؤنٹ توربین ایک بیوہ عورت آننا فیودرروونا کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے جس کی ایک بیٹی ''لیزا'' بھی ہوتی ہے۔بعض وجوہات کی بناء پر کاؤنٹ اپنی محبت کے حصول میں ناکام نظر آتا ہے۔اسی طرح کاؤنٹ کا بیٹا اس عورت کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور آخر میں باپ کی طرح ادھوری محبت اس کا مقدر ٹھہر جاتی ہے۔

ٹالسٹائی کی کہانی ''شراب اور شیطان'' بہت معنی خیز کہانی ہے۔جب انسان کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ صبر وسکون سے کام لیتا ہے۔لیکن یونہی جب ضرورت سے زیادہ ہوا تو وہ فورا گناہ اور عصیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔کسان اپنا کھانا گم ہونے پر بھی صبر وسکون کا دامن نہیں چھوڑتا لیکن جب کسان کے پاس غلے کی کثرت ہو جاتی ہے تو فورا اس کا کردار تبدیل ہو جاتا ہے۔صبر و توکل والا انسان جوش و توکل کو کام میں لاتا ہے۔اس کی سادگی، معصیت اور سیاہ کاری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔وہی شیطان جو غریب اور مفلس کسان کو گمراہ کرنے میں ناکام ہوا، کسان کے پاس ضرورت سے زیادہ غلہ جمع کر دیتا ہے۔کسان اس غلہ کو غربا میں تقسیم کرنے کی جگہ اس سے شراب نکالتا ہے اور اپنے دوست احباب کو مدعو کرتا ہے۔شراب پینے کے بعد تمام مے نوش ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے ہیں مثلاً:

> بوڑھا شیطان اپنے شاگرد سے دریافت کرتا ہے ''شراب کی ایجاد خوب رہی۔مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ شراب وحشیوں اور درندوں کے خون سے تیار کی ہے۔'' شاگرد جواب میں ترغیب گناہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔''نہیں استاد! اس

میں درندوں وغیرہ کا خون نہیں۔ میرے لئے سب سے ضروری چیز یہ تھی کہ کسان
کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہو تو وہ خون اپنی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے۔"(۱۲)

متذکرہ بالا کہانی کی طرح ٹالسٹائی کی ایک اور بہترین کہانی "تین سوال" ہے۔ اس کہانی میں قدیم طرز داستان کی جھلک نمایاں ہے۔ یہ ایک بادشاہ کے طرز فکر کی داستان ہے جو اپنے دور حکومت کو بے مثال بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ اس کے ذہن میں تین سوالات ابھرتے ہیں اور پھر وہ ان کے مناسب جواب کا متلاشی ہوتا ہے۔ اپنی ریاست کے صاحب علم و فضل علماء و حکما، وزراء اور دانش مندوں سے رجوع کرتا ہے مگر حسب منشا جواب پانے سے قاصر نظر آتا ہے۔ یوں بادشاہ اپنی ریاست کے معروف درویش کے پاس بھیس بدل کر جواب تلاش کرنے نکلتا ہے۔ وہ سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں مثلا

۱۔ کسی کام کو شروع کرنے کا موزون وقت کونسا ہے؟

۲۔ کن اشخاص سے صحبت رکھنی چاہیے اور کن سے پرہیز؟

۳۔ دنیا میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری چیز کیا ہے؟

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات درویش کچھ اسطرح سے دیتا ہے جو کہ بہت معنی خیز ہیں

۱۔ کسی خاص کام کے لئے صرف ایک ہی موزوں وقت ہوا کرتا ہے جبکہ ہم میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ ہم اسے سر انجام دے سکیں۔

۲۔ سب سے ضروری اور اہم شخص وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ تم اس وقت موجود ہو کیونکہ اس بات کا معلوم کرنا کہ اس شخص کے سوا تمہیں کسی اور سے بھی واسطہ پڑے گا، انسان کے وہم و قیاس سے بالا ہے۔

۳۔ سب سے ضروری اور اہم کام اس شخص سے نیکی کرنا ہے کیونکہ خدا نے انسان کو صرف اسی غرض کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔(۱۳)

کوئی بھی ادیب اپنے عہد کے حالات و واقعات سے انکار یا انحراف نہیں کر سکتا ہے۔ ٹالسٹائی کا احترام کرنے والے اور اس کی شخصیت سے متاثر ہونے والے چیخوف نے یہاں ٹالسٹائی کے متعلق اپنے تاثرات کی گہرائی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

کیا دلچسپ انسان ہے۔ آپ ذرا اسے سمجھنے کی کوشش کر دیکھیے۔ عین ممکن ہے اسی میں
ڈوب جائیں۔ جیسے اتھاہ کنویں میں ڈوبتے ہیں۔۔۔۔ روحانی قوت کیا زبردست ہے اس

سے باتیں کرنے میں یوں محسوس ہوتا ہے گویا آپ سراپا اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ میں آج تک کسی شخص سے نہیں ملا، جس میں ٹالسٹائی جیسی پرکشش اور یوں کہیے کہ ہم آہنگ، متناسب شخصیت ہو۔ ٹالسٹائی اول تا آخر ہم آہنگی اور حسن ہے۔ اس کے ساحرانہ روحانی وجود میں کوئی ایک بھی نقش، نہایت معمولی سامد بھی ایسا نہیں جو مکمل نہ ہو۔ اس میں ہر شے قطعی، طے شدہ، صاف اور سلجھی ہوئی ہے انتہا درجے کی۔۔۔۔ یہ شخص تقریباً مکمل انسان ہے۔ کوہ تا نظر نکتہ چیں مین میخ نکالتے ہیں کہ دورخاپن ہے۔ کہتے ہیں گویا اس کی فطرت میں ایک تو ہے فنکار اور دوسرا ہے فلسفی۔ اور دونوں ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے آئے ہیں۔ کیا بکواس ہے! ٹالسٹائی اپنی فنکارانہ تحریروں میں اتنا ہی فلسفی ہے جتنا وہ فلسفے میں فنکار ہے یہ حیرت انگیز حد تک مکمل فطرت ہے۔ (۱۴)

جس طرح ہر شے کا ایک مرکز ہوتا ہے اسی طرح روسی ادب کا مرکز ٹالسٹائی کہلاتا ہے۔ ادیب اپنے معاشرے کا نباض ہوتا ہے اور روسی معاشرے کا نباض ٹالسٹائی ہے جس نے اپنی تخلیقات میں روسی معاشرے کو موضوع بنایا ہے۔ اسی طرح وہ ایک زیرک اور صاحبِ بصیرت ادیب ہونے کے ناطے انسانی فطرت، عادات واطوار اور انسانی محسوسات کو زبان دینے کا خاصہ رکھتے ہیں۔ ادب کا موضوع انسان کی ذات، اس کے جذبات واحساسات کی دنیا رہی ہے۔ بحیثیتِ ادیب ٹالسٹائی نے اپنے اس فرض کو بخوبی نبھایا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ٹالسٹائی کو جو عہد میسر آیا وہ کرب، اضطراب، بے چینی، اندرونی و بیرونی خلفشار کا زمانہ تھا۔ اور ادب کی تخلیق کے لیے ایسا ماحول اور ایسا زمانہ بہت زرخیز ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں بے یقینی، اضطراب اور خلفشار کا عمل دخل ہوتا ہے تو ادیب کو نئے نئے موضوعات ہاتھ آرہے ہوتے ہیں اور ہمیشہ سے اچھا ادب اسی طرح کے حالات وماحول میں تخلیق ہوتا رہا ہے۔ انہی حالات سے نبرد آزما معاصر روسی تہذیب و تمدن، معاشرہ اور افراد معاشرہ اور اس معاشرے پر ان حالات کے پڑنے والے اثرات کو ٹالسٹائی نے بہت عمدہ انداز سے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔

## حوالہ جات

۱۔ محمد یسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، دارالنور، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۱۴۳

۲۔ ٹالسٹائی، گھریلو مسرت، ٹالسٹائی کی کہانیاں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۳۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۴۔ ٹالسٹائی، گھوڑے کی آپ بیتی، ٹالسٹائی کی کہانیاں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۸۸

۵۔ ٹالسٹائی، کریتزر سوناٹا، ٹالسٹائی کی کہانیاں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۳۲۲۔۳۲۴

۶۔ ایضاً، ص ۳۲۲

۷۔ ایضاً، ص ۳۶۱

۸۔ عتیق اللہ، تعصبات، ایم۔ آر۔ پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص ۳۱۱

۹۔ یاسر حبیب، اردو ادب کے عالمی تراجم، رقص کے بعد، ٹالسٹائی، مترجم، صابرہ زیدی، حصہ اول، ۱۵۷

۱۰۔ یاسر حبیب، اردو ادب کے عالمی تراجم، مترجم، صابرہ زیدی، حصہ اول، ص ۱۵۲

۱۱۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر، انتون پاولووچ چخف کی زندگی اور فن کا مطالعہ، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۰

۱۲۔ منٹو، سعادت حسن، روسی افسانے، دارالادب پنجاب، لاہور، ص ۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۴۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر، انتون پاولووچ چخف کی زندگی اور فن کا مطالعہ، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۹۔۱۲۹

شکیل حسین سید
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ ملت ڈگری کالج ملتان

# ڈاکٹر انوار احمد کی افسانہ نگاری

## Dr. Anwar Ahmad as a short story writer

Anwar Ahmad is not only the critic of Urdu short story writing but also a unique and great short story writer. In the stories of 'AkhariKhat', new topics and a new though are evident. His style is also unique. His style is perfectly in accordance with his themes. Every idea, every emotion and every thought finds its true expression and narration. His characters are also a perfect match for their peculiar regions, language and mentality. These stories reflect contemporary civilization and society. These stories impart versatile themes, new technique and style. His stories show that the has a very strong relation with the tradition as as well as modern trends. Through these stories, he has come out to be a unique artist is short story writing.

**Keywords**: *Urdu short story, Akhri Khat, versatile technique and style, civilization and society of Pakistan*.

ہر ادیب اپنے عہد میں اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا کر ادب کی مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتں آزماتا ہے اور ہمہ جہت شخصیت کے حوالے سے یہ کہنا بہت مشکل ہو گا کہ ادب کی کس صنف میں کتنے کامیاب اور کتنے ناکام ہیں؟ ایسے میں کسی ادیب کے بارے میں یہ طے کرنا کہ وہ کس صنف میں زیادہ کامیاب ہے؟ اور کتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وقت اس کا فیصلہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار اور "یادگار زمانہ ہیں جو لوگ" کے منظرِ عام پر آنے سے ایک خاکہ نگاری کے حوالے سے بھی اپنی پہچان کروا چکے ہیں۔ ایک نقاد اور خاکہ نگار کی حیثیت سے ان کا جو بھی مقام ہو مگر بحیثیت افسانہ نگار وہ بلند پایہ اور منفرد فنکار ہیں۔

"آخری خط" مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد طبع ہونے والا نیا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ۲۸ کہانیاں ترتیب دی گیٰ ہیں۔ ۲۱ افسانے جو ۱۹۷۲ء سے ۲۰۰۷ء تک بالترتیب "ایک ہی کہانی" اور "پہلے سے سنی ہوئی کہانی" دونوں مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اسی مجموعے میں 'گوشہ ترکی' میں پانچ (۵) اور گوشہ جاپان میں دو (۲) افسانے شامل کیے گئے ہیں۔

یہ آخری خط 'نمروت کی چوٹی سے'، 'اُمیت کوئے'، 'انقرہ کے غلوپارک' کی 'لالے گل' جاپان سے 'شیاما' اور 'ناؤ می' کی دکھ بھری کہانی لایا ہے۔

"آخری خط" کے پہنچنے میں تاخیر یا باعث تاخیر جو بھی ہو یا شاید ڈاکٹر انوار احمد جو افسانے کے ثقہ قاری ہونے کے علاوہ اردو افسانے کی تنقید میں نمایاں نام رکھتے ہیں، تخلیقی عمل کے دوران افسانے کا سخت ناقد اُن کی تخلیقات پر کڑی نظر رکھتا ہے اور حساس ہونے کے باعث اُن کا تنقیدی شعور افسانے کی اشاعت اور اُن کے انتخاب پر مجبور کرتا ہے اور "آخری خط" میں شامل افسانوں کا انتخاب اُن ناقدانہ نظروں کا عکاس ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ معیشت و معاشرت، ادب و مذہب اور سیاست کے ستونوں پر قائم ہوتا ہے۔ عصرِ حاضر میں سیاسی حوالہ اس لیے توانا اور موثر ہے کہ اس راستے سے آنے والی تبدیلیاں سماجی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتی ہیں۔ "آخری خط" میں شامل ابتدائی افسانے عصری انتشار کی وجوہ میں سیاسی بدامنی کو سب سے بڑا محرک ظاہر کرتے ہیں۔ اس محرک نے معاشرتی زندگی اور انسانی اعمال و اخلاقیات اقدار کا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ سیاسی صورتحال بالخصوص مارشل لا اور اس کے جبر کے تناظر میں سیاسی و سماجی خرابیاں جہاں اُن کے افسانوں کا اہم موضوع بنتی ان کی ترقی پسند فکر کی غماز بھی ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے ان کہانیوں کو ملکی سیاسی صورتحال کے پس منظر اور پیش منظر، سماجی حقیقت نگاری، ترکی اور جاپان کی تہذیب و معاشرت کے پس منظر میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ستر کی دہائی میں پاکستان کو جغرافیائی سطح پر دولخت ہونے کی وجہ سے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ عدم تشخص کا سوال جو پہلے ذات کے تعین کے حوالے سے اٹھا تھا اب قومی سطح پر حل طلب تھا۔ افسانہ "آسٹر وٹرف" پاکستان کے ملکی و سیاسی مسائل ہجرت کے بعد اپنی تہذیبی جڑوں اور شناخت کی تلاش، معاشی جبر اور سیاسی حالات کی بدولت اختیار کی جانے والی جلاوطنی، عدم تحفظ اور محرومی کے احساس کو عمر رسیدہ متکلم کی خود کلامی کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔

> "ہماری شکست کی وجہ آسٹر وٹرف ہے۔ یہ زمین کے اوپر زمین ہے مگر اسے زمین بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی خصوصیات یہ ہے کہ اگر اسے مسلسل پانی نہ پلایا جائے تو اس پر چلنے والوں کے تلوے جلتے ہیں کیا اسلام کو اس قلعے کو اپنی مٹی بھی نصیب نہیں ہو سکی"(۱)

جنرل ضیاء الحق مارشل لا کا گیارہ دو سالہ طویل عرصہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں تاریک دور ہے۔ سیاسی اور جمہوری سرگرمیوں کا تعطل من پسند اسلام کی تعبیریں، قید و بند، جسمانی تشدد، غیر انسانی سزائیں، سر عام کوڑا زنی، جبر و خوف کا دور تھا۔ دور آمریت میں اختلاف رائے رکھنے والوں پر ظلم و تشدد سے اور خوف و ہراس پھیلا کر انہیں خاموش یا اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے اور اضطراب، خوف احساس تنہائی اور معاشی و معاشرتی استحصال کے ذریعے عوام سے مزاحمت اور احتجاج کا حوصلہ چھیننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود بھی ظالم و جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے والوں کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں۔

افسانہ "پہلا محب وطن بچہ" میں ایک ایسے ہی قدیم اور تاریخی شہر میں ایسی رعایا پیدا کرنے کی کوشش ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔ آخری شخص جو سوچ و بچار کے جرم کا مرتکب ہو کر غدار ٹھہرا تھا اس نے گھناؤنی سازش والی رات خسرو کے ٹوٹے ہوئے ستار سے اپنی زبان کاٹ لی تھی۔ کیونکہ محب وطن وہی ہے جو سوچتا نہ ہو۔

> "کچھ عرصہ اس نے سکول ماسٹری کی ننھے معصوم بچے اپنی توتلی زبانوں کے ساتھ جب سوال کرتے تو اس کی کوشش ہوتی کہ ان سوالوں کے ایسے جواب دیئے جائیں کہ وہ اور سوال کریں تاکہ وہ خود یا ان کے بڑے سوچنے لگ جائیں کہ حاکم رعایا کی زبانوں سے کیوں ڈرتے ہیں؟ خود ساختہ امیر المؤمنین کیوں کہتے ہیں کہ محب وطن وہی ہے جو سوچتے بالکل نہ ہوں" (۲)

"جب راج کرے گی خلق خدا" میں جبر و تشدد کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے لئے سر عام سزاؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نام نہاد اسلامی حدود آرڈیننس کی آڑ میں معصوم اور بے گناہ لوگوں کو حوالات میں قید کرنا۔ معمولی جرائم کے الزام میں ذاتی مفادات کے پیش نظر عوام الناس کے ذہنوں میں ڈر اور خوف پیدا کرنے کے لئے ان کی چیخوں کی آوازیں دور دور تک پہنچا کر انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنا ہے۔

> "پھر ٹکٹکیوں سے باندھ کر باضمیروں کو اس طرح کوڑے مارنے کی ہدایت آئی کہ ان کے منہ کے آگے مائیک رکھ کر چیخوں کو مہیب اور عبرت ناک بنا دیا جائے" (۳)

"کمال بستی جڑا چوک میں" ان نام نہاد عدالتی کاروائیوں پر طنز کیا گیا ہے جو ہر نئے حاکم کے تسلط کو قائم رکھنے کے لئے ابن الوقتی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ان عدالتی کاروائیوں میں جسے چاہیں وطن دشمن اور غدار ثابت کر کے

خود ساختہ مقدمات میں پھانسی پر لٹکا دیں۔ افسانہ میں ان روشن خیال ترقی پسند عوام کے نمائندوں کو سیاسی قیدی بنا کر عقوبت خانوں میں جسمانی و ذہنی تشدد اور ان پر تھرڈ ڈگری استعمال کر کے انہیں اپنے مقصد سے پیچھے ہٹنے معافی نامہ پر دستخط کرنے پر مجبور کیئے جانے کو اجاگر کیا گیا ہے۔

"میں ساری زندگی زیر تفشیش رہا مرے آقا یہ دیکھو حلف توڑنے والوں نے میرا ہر ناخن گوشت سے جدا کر دیا ہے۔ چوری کی ہوئی بجلی سے میرے جسم کے نازک حصوں کو جھٹکے دیئے گئے ہیں" (۴)

"بچھوؤں کے ساتھ رات" میں علامتی انداز میں ان استعماری قوتوں (امریکہ) کو موضوع بنا کر پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک کڑوے سچ کو بیان کیا گیا ہے۔ اپنے ذاتی مفادات اور مصلحت کوشش حکمرانوں نے اپنی گونگی ماں (دھرتی، وطن) بچوں (عوام) کو ان بچھوؤں کے حوالے کر دیا ہے جو عوام کا بدن کاٹ کاٹ کر نیلا کر رہے ہیں۔ بہت سی کوشش کے باوجود مرتے نہیں بلکہ مکڑے اور بچھوں ہمیشہ سے تتلیوں کے مقابلے میں جنگ جیت جاتے ہیں تاہم تتلیاں مرنے سے پہلے اپنی تڑپ اور پھڑک سے مزاحمتی رنگ ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔

"یرغمالی" جمہوریت اور آمریت کی کشمکش کے تناظر میں لکھا گیا علامتی افسانہ ہے جس میں ٹرین کا اپنے سٹاپ کے بغیر رکنا، جمہوری حکومتوں کا اپنے وقت سے پہلے معطل ہونے اور ملک پر ایک بار پھر مارشل لاء کا اشارہ ہے۔ "آخرت ایکسپریس" میں پاکستان کی کٹھ پتلی حکومتوں،، نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لئے عالمی قوتوں کے حربے اور ملک کی سادہ لوح عوام کو مذھب کے نام پر بے وقوف بنانے کے لئے علماء کرام مجہول تقدیر پرستی کا پرچار کر کے ان طاقت ور نادیدہ ہاتھوں کو طاقت پہچانتے ہیں اور عوام جذباتی استیصال کرتے ہیں۔

"وزیر اعظم نے بے چینی سے وزیر مذہبی امور کی طرف دیکھا اور کہا یہ بجٹ اسپیچ آپ مکمل کریں گے۔ قوم کو قربانیوں کے لئے تیار کرنا ہے اسمیں اسلام کا فلسفہِ قربانی ڈال دیجئے۔" (۵)

"گرجھوں والی سرکار کی دعا" میں دکھیاری ماں علامتی کردار ہے جس کا آدھا ننگا سر آدھے پاکستان کی علامت ہے۔ یہ دکھیاری ماں پاکستان کے سیاسی حالات بالخصوص جنرل ضیا کے مارشل لاء کے ظلم و جبر تشدد اور بھٹو کی پھانسی کی المناک داستان سناتی ہے جو اس تاریک دور ضیا میں ملک کے دانشوروں، وفاداروں اور روشن خیال دوستوں کے ساتھ نجی و سرکاری عقوبت خانوں میں رکھے گئے ہیں۔

"سائیں جی، آکھدی اے جو میں، ماں ہاں، پر جس پتر سے میری بنی ہو یا وہ میری خدمت کرنے جو گا ہو اس اس کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ میں منت زاری کروں تو کہتے ہیں کو دن رن یہ تمہارے ہی فائدے میں ہے ورنہ یہ پتر بھورے تو تیرا سودا کیے بیٹھے ہیں میں ہتھ جوڑ کے کہتی ہوں کہ ماں سے بھی تو پچھے جو کون کملا اس کی عزت و آبرو کا پہرے دار ہے اور کون چندرا سوداگیر۔" (۶)

'پہلا محب وطن بچہ'، 'دارداں دی ماری دلڑی علیل اے'، 'پہلے سے سنی ہوئی کہانی'، 'بچھوؤں کے ساتھ رات'، 'انتظار میں ڈوبا ہوا گھر' اور 'اب راج کرے گی خلقِ خدا۔' ان کہانیوں میں جہاں شخصی بے حسی موجود ہے احتجاج اور مزاحمت کے رویے بھی کہانی کی زیریں سطح پر موجود رہتے ہیں جو کہ نعرہ اور پروپیگنڈا نہیں بنتے البتہ مارشل لائی جبر کے خلاف لکھتے ہوئے طنزیہ اسلوب نمایاں ہے۔

"اس کی وردی پر بہت سے تمغے چمک رہے تھے، اس نے ایک ہزار واٹ کے بلب کا رُخ مطلوبہ سمت میں کیا اور کہا" تخم حرام! ماں کے ساتھ بدکاری کرتے ہو؟"

جناب والا! میری ماں کے ساتھ تو بدکاری آپ نے کی ہے، یہ ریفرنڈم کرا کے "

"اس کتیا کی اولاد کو اس کی ماں کا پیشاب پلاؤ۔" (۷)

ستر کی دہائی میں مارشل لا کے خلاف معاشرتی اور سیاسی رد عمل میں ترقی پسند ادیبوں نے مزاحمتی اور احتجاجی ادب تخلیق کیا۔ ضیاالحق کا بدترین مارشل لا سقوط ڈھاکہ اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے واقعات نے اُردو ادب کو بالخصوص افسانوی ادب موضوع اور فکر کو نئی جہات سے روشناس کرایا۔ ان افسانوں میں مارشل لا کے مظالم جمہوریت پسندوں اور روشن خیال عوام پر مذہبی اصطلاحات کی آڑ میں تشدد۔ مارشل لا کو طول دینے کے لیے نام نہاد ریفرنڈم، سیاسی مخالفین کو رام کرنے کے لیے لالچ اور شرمانے والوں پر کوڑوں کی سزائیں مکالماتی اور کہیں علامتی اسلوب میں بیان کی گئی ہیں۔

"پھر سانپ جیسی آنکھوں والے کا دور آیا اور نئے سرے سے مسلمانوں کے جتنے چیک ہونا شروع ہو گئے۔ ایک صالح جماعت نے اس حاکم کے سائے میں اخبارات، سرکاری ملازمتوں خاص طور پر تعلیمی اداروں میں طہارت کے بہانے کئی لوگوں پر رزق کے دروازے بند کرنے شروع کیے"۔ (۸)

ذوالفقار علی بھٹو جو روشن خیال ادیبوں اور اس خطے (پاکستان) کی نئی امید تھا جو ایوبی مارشل لا کے بعد عوامی اور جمہوری لیڈر کے طور پر سامنے آیا روٹی کپڑا اور مکان کے نعرہ میں مقہور اور پسی ہوئی عوام کو اپنی منزل دکھائی دینے لگی جسکی خاطر انہوں نے ۱۹۴۷ء میں قربانیاں دیں تھیں۔ مگر ایوبی اور ضیا الحق کے مارشل لا نے اُن کے سارے خواب اور خواب دیکھنے والوں کی آنکھوں کو نوچ پھینکا اور ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ "درداں دی ماری دلڑی علیل اے" روشن آنکھوں والے بھٹو علامتی اور اساطیری حوالے سے افسانے کو قومی تاریخ کی دستاویز کے ساتھ ساتھ افسانوی جدت عطا کرتے ہیں۔

> "اور پھر جو رات آئی، تو اس کی صبح نہ ہو سکی آدھی رات کے اندھیرے میں ہی روشن آنکھوں والے کی لاش ہم میں اس طرح رکھ دی گئی کہ ہم سب اس وہم میں مبتلا ہوئے کہ قاتل ہم ہی ہیں اور کبھی اس خوف میں گرفتار کہ مقتول بھی ہم ہیں ذرا دیر بعد ہم میں جو ہوش میں آیا وہ رونے لگا فوراً اس پر ایک باز جھپٹا۔۔۔تب ہم پر یہ کھلا کہ ہمیں گریہ کا حق بھی نہیں"۔ (۹)

سیاسی آشوب کے تناظر میں ان کہانیوں میں طنز کے نشتر علامتی اور استعاراتی اسلوب کہانی کے حسن اور فنی تقاضوں سے متجاوز نہیں ہوتا۔ اصغر ندیم سید لکھتے ہیں:

> "وہ احتجاج کے لہجے میں بھی فنی تقاضوں کو اولیت دیتا ہے حالانکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ احتجاج اتنا بھرپور ہو کہ دشمن کی کمر توڑ دے لیکن وہ اس طرح اپنے کرافٹ کی باریکیوں اور پہلوؤں کو ضائع کر کے مقصد حاصل کرنے کو ترجیح نہیں دیتا"۔ (۱۰)

انوار احمد کی کہانیوں کا دوسرا بڑا موضوع معاشی و معاشرتی، اخلاقی و تہذیبی مسائل ہیں۔ بیسویں صدی کے سیاسی واقعات کے تناظر نظریاتی و جماعتی، آویزش معاشی و سماجی سیاسی چیز کی بدولت نقل مکانی اور بیسویں صدی کی تہذیبی سطح پر معاشرتی ٹوٹ پھوٹ لایعنیت، روحانی اور ذہنی کرب اور نفسیاتی الجھنوں کو پیش کرتی ہے۔

"نوں جی" معاشرتی قدروں زوال کے ساتھ ساتھ اقتصادی مجبوریوں اور کساد بازاری کی داستان ہے۔ رکشے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے نقدی "جسم" ہے مگر رکشہ ڈرائیور کے لیے جسم کی پونجی سے روپیہ اہم ہے اس لیے وہ اُس کے برہنہ جسم سے نظریں چراتے ہوئے اس کے اتارے ہوئے کپڑے کرائے کے متبادل کے طور پر لے جاتا ہے کیونکہ گھر میں نوں جی ہیں جن کے پیٹ پالنے کے لیے روزی روٹی اسکی جنسی خواہشات سے زیادہ اہم ہیں۔

"مجھے اندر بلا لیا اور کہنے لگی "میرے پاس پیسے بالکل نہیں مگر گھر او نہیں میں پورا کرایہ چکا دوں گی"۔ اُس نے تو جی ایک ایک کر کے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے بس جی اس نے ایک جھلنگی چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور لمے لمے ہو کے بھرنے لگ گئی، موتیاں والیا! میں نے وہ کپڑے اٹھائے اور وہاں سے دڑک لگائی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "لعنت ہو تم پر خدا کی" بلکہ پوری ملت اسلامیہ کی۔ وہ کہنے لگا باو جی! میرے گھر کھان والے نوں جی ہیں"۔ (۱۱)

مارشل لاء جمہوری اور سیاسی ڈھانچے کو توڑ کر زبردستی مسلط کردہ آمریت کا نظام ہوتا ہے۔ جو پورے سماجی و معاشرتی نظام کو اندر باہر سے مسخ کرتے ہوئے ایسی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے جو ہوا میں معلق ہوتی ہے۔ جو آمر کے ہٹتے ہی زمین بوس ہو جاتا ہے۔

"گونگی غراہٹ" قیام پاکستان کے بعد حاجی خواجہ جیسے استحصالی طبقے کی کہانی جو سرمایہ اور دولت فروانی سے معاشرے میں معزز مقام حاصل کر چکا ہے لیکن دولت کی یہ فراوانی معاشرے کے غریب ناداروں کا خون چوس کر حاصل کی گئی ہے۔ مختلف خیراتی اداروں کو وظیفے دے کر، قومی معیشت اور انسداد سمگلنگ پر تقریریں کرتے ہیں۔ مشاعروں اور مذاکروں میں مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ سب جانتے ہوئے بھی بول نہیں سکتے۔ ان کے الفاظ حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں ان کی دولت پسے ہوئے طبقات کی آواز کو گونگی غراہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے

"میں اپنے حاجی خواجہ کے بیچے سو سو کرتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ یہ اطلاع بھی فراہم کر رہا تھا کہ رب ذوالجلال کی عنایت سے سارے ٹرک خیر وعافیت سرحد پار پہنچ چکے ہیں اور حاجی خواجہ بار بار اپنے اوور کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنے سوٹ کی ایک جیب میں موجود اس تقریر کو ٹٹول رہا تھا جو اسے قومی معیشت اور سمگلنگ کے انسداد کے موضوع پر ہونے والے مذاکرے میں بطور مہمان خصوصی کی حیثیت سے کرنا تھی"۔ (۱۲)

جدید سماج میں صنعتی ترقی اور مادیت پرستی کی دوڑ میں انسانی اقدار اور اخلاقی زوال ہوس زر نے انسان کو اس حد تک پستی سے دوچار کر دیا ہے کہ رشوت، جھوٹ، ہیرا پھیری، معاشرتی اور اخلاقی برائیاں زندگی گزارنے اور آمدن میں اضافہ کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ مادیت پستی نے انسانی زندگی اور رشتوں میں بھی معنویت اور لایعنیت پیدا کر

دی ہے "ڈاکٹر دل محمد اور درد دل اور "محبت کی سیکنڈ ہینڈ کہانی" جس میں محبت کے جذبے کو ہوس، لالچ اور منافقت سے آلودہ دکھایا گیا ہے۔ حسن و عشق میں جو ازل سے اعتبار و اعتماد کا رشتہ تھا محبت کا یہ جذبہ آج زوال پذیر ہے۔

"دل محمد کسی کا بند ھیل نہیں کسی کا رکھیل نہیں۔ اس طرح کے رشتوں میں وفا اور بے وفائی کا حساب کہاں سے آ گیا؟ وہ خود بھی کسی کے ساتھ اعلانیہ رہتی تھی جس کو شوہر مانتے ہوئے وہ جھجکتی تھی"۔ (۱۳)

"نئی دنیا کی تلاش" اور "درخواست گزاروں کا میلہ" جدید صنعتی سماج میں انسانی اقدار کی پامالی، تیل کی دولت، سامراجی اور استعماری حربے ۹/۱۱ کے بعد انسان دولت کے نام پر اس روئے زمین پر آگ و خون کی ہولی کھیلنے والے پاپی نام نہاد ترقی اور تہذیبی برتری پر فخر کرنے والوں پر طنز کیا گیا ہے جنہوں نے اس کرہِ ارض کو جہنم بنا دیا گیا ہے۔

"پھر کولمبس جو نیئر کا لہو منجمد ہونے لگا کیونکہ اس نے دیکھا کہ معصوم انسانوں ہلاکت نازل کرنے والے مقتولین کے لہو سے ان کے جسموں اور پوشاکوں پر تہذیبی برتری کے نشان بنانے لگے"۔ (۱۴)

"آخری خط" کی کہانیوں میں موضوعات کی نئی فکری جہت نظر آنے کے ساتھ منفرد اسلوب کے نقوش بھی متعین ہونے لگتے ہیں اور انہیں نقوش میں روایتی اُسلوب کا رنگ ہے اور زبان و بیان میں نیا پیرائیہ بیان کے آہنگ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

بیانیہ موضوع کے تناظر میں ہر لمحہ تبدیل ہوتا ہے۔ بیرونی دباؤ کے حوالے سے زبان و بیان کا سانچہ مکمل طور پر مختلف ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں ہر خیال، ہر جذبہ، ہر فکری لہر اپنے اظہار اور بیان ساتھ لے کر اُبھرتی ہیں اور کردار اپنے مخصوص، مقامی، فطرت، زبان اور ذہنیت میں ڈھلتے نظر آتے ہیں:۔

"او سائیں گرجھوں والی سرکار! اس سے پہلے کہ میرا یہ ادھا سر بھی ننگا بچا ہو جائے، اس بستی کوں برباد چاکر، جو ظلم تے قہر کے برباد ہونے کا بیاراستہ نظر نہیں آتا۔"(۱۵)

مقامی زبانوں کے نامانوس محاورے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال اُن کی کہانیوں میں اُسلوب کو نیا پن دیتا ہے اور یہی جدت اور انفرادیت اُن کے ہاں حقیقی اور فطری صورتحال کو جنم دیتی ہے۔

اس مجموعہ میں "آخری خط" میں ہندی، جاپانی اور ترکی زبان کے الفاظ کمال فن سے برتے گئے ہیں۔ مثلاً "کاردیش"، "خوش گیلا نیز"، "ایکمک"، "اچک"، "کارن"، "ہاہا"(ماں)، "کین اینونا"، "سہائتا"، "پرنتو"، "اشیر واد"، "اینو موادو کیبابوتی اتارو" وغیرہ۔

یہ الفاظ موضوع کی وضاحت، مکالمے اور منظر نگاری کی وضاحت میں مدد گار ہیں۔ اُسلوب میں جدت کے ساتھ ہی زبان کی نفاست اور لطافت دوچند ہو جاتی ہے۔

افسانہ "آخری خط" مونولاگ بیانیہ ہے۔ جو اپنی اہمیت اور جداگانہ پس منظر کی بدولت منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں ممتاز شیریں لکھتی ہیں کہ:۔

> "ایک آدمی اپنی باتیں اور دوسروں سے کہی جانے والی باتیں تفصیل سے سناتا ہے۔ اگر یہ باتیں کہی جائیں تو افسانہ مونولاگ بن جاتا ہے، لکھی جائیں تو خط، مونولاگ میں بیان کرنا، یا خط کی صورت میں لکھنا بڑی آسان تکنیک ہے لیکن اس سے افسانہ بڑا اثر انگیز ہو جاتا ہے۔"(١٦)

جاپانی، معاشرت کی یہ کہانی مونولاگ ٹائپ میں لکھی ہوئی کہانیوں میں اہمیت کی حامل ہے۔ یہی جدت، اُسلوب کی رنگینی آخری خط، مجموعہ کی دوسری کہانیوں "گوشہ جاپان" اور "گوشہ ترکی" کی کہانیوں میں جھلکتی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد نے ان کہانیوں میں اپنے مشاہدات و تجربات کے ساتھ ان ممالک کی معاشرتی و ثقافتی، علمی و ادبی زندگی کو بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں اور خصوصاً ان ممالک میں مسلمان جو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہیں بھی موضوع بنتے ہیں۔

ان ممالک میں بھی 'کوغلوپارک' میں بیٹھی سنہری بالوں اور سبز آنکھوں والی "لالے گل' کو اک سچے پیار اور وفادار ساتھی کی تلاش ہے۔ وہاں کی شیاما بھی کہانیاں سننے سے دلچسپی رکھتی ہے۔ وہاں بھی لوگ شوکیس میں بند اشیا اور شاپنگ کرتے ہوئے مصروف لوگوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور پھٹے پرانے جوتوں میں ملبوس بچے قلم، ٹوتھ پیسٹ، یا چاکلیٹ، فٹ پاتھ پر بیچتے نظر آجاتے ہیں۔ ان ممالک میں بھی والدین اپنی بیٹیوں کے گھر بسانے کی فکر میں ہیں۔ نیلگوں کی ماں اپنی بیٹی کو ایک قابل اعتماد ساتھی کے ساتھ ایک گھر میں دیکھنا چاہتی ہے۔

جہاں غربت یا جہالت ہے صرف وہاں مرد کا ہاتھ نہیں اٹھتا بلکہ ان ترقی یافتہ ممالک کی عورتیں بھی مردانہ معاشرے کا شکار ہیں۔

"وہ کہنے لگی ہم اتاترک کے ممنون ہیں کہ تعلیم، قانون اور سیکولر معاشرے نے ہم عورتوں کو اس طرح کے استحصال سے بچالیا ہے، اتنی دیر میں قریب کے ایک گھر سے غصیلی آواز گونجی اور پھر یہ آواز متشدد ہوتی گئی، دیہاتی وضع کی ایک عورت بھاری شلوار پہنے واویلا کرتے گلی میں آئی اس کے پیچھے فلمی انداز میں مونچھوں والا ترک ہاتھ میں چھڑی لیے چلا آیا، نوریئے کہنے لگی کہ اصل میں جہاں غربت ہے، وہاں ابھی بھی مرد کا عورت پر ہاتھ اٹھ جاتا ہے، مگر کچھ ہی دیر کے بعد اسے ایک فون آیا، جس پر اس کا اپنا چہرہ فق ہو گیا۔"(۱۷)

وہاں بھی شوہر کی وفات پر بیوہ عورتیں سجتی سنورتی نہیں اور نہ ہی خوشبو لگاتی ہیں۔ ان اَن دیکھی تہذیبوں اور معاشرت کو اِن کہانیوں میں ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے شگفتہ اسلوب اور افسانے کی جدید تکنیک سے اپنی کہانیوں کو یوں ڈھالا ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنے خطے کی معاشرت اور اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے کردار اور ماحول کی تصویر نظر آتی ہے۔ وہاں کی بے باکی، جنسی بے راہ روی، کا تذکرہ کرتے ہیں مگر ساتھ ہی قاری پر اپنی شرافت اور پاکیزگی کا رعب بھی نہیں ڈالتے۔

'محبوب خلائق اور مردانہ ہاتھ'، 'تبریزی لب اور حکایت نے' ان کہانیوں میں تاریخی واقعات کو اپنے شگفتہ اسلوب اور فطری حاضر جوابی کی بدولت اُکتاہٹ پیدا نہیں ہونے دیتے۔

"میں نے کہا میرے شہر میں ایک محلہ ہے، جہاں ایک مذہبی مدرسے کے دروازے پر سوہن حلوے کی دکان بھی ہے، ایک بورڈ پر لکھا ہوا کہ یہاں مسلمان کے لیے حلالے اور سوہن حلوے کا بندوبست کیا جاتا ہے، اس نے کہا سوہن حلوہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ بھی مردوں کے کام ہی آتا ہے۔"(۱۸)

وہ ان ممالک کی تہذیب اور معاشرت اور اپنی معاشرت سے موازنہ نہیں کرتے بلکہ حقیقی تصویر دکھا کر نقطہ نظر لاتے ہیں جو ان کی گہری بصیرت کی غماز ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد کی کہانیاں بھی "ناؤمی" کے اپنے باپ کو لکھے ہوئے آخری خط، کی طرح ہیں آپ انہیں جس طریقے سے پڑھیں ہر طریقہ میں اپنے نئے معانی اور مفاہیم عطا کرتی ہیں۔

یہ کہانیاں اپنی عصری تہذیب و معاشرت کا دوسرے ممالک کی حقیقی تاریخ، تہذیب اور معاشرت کی عکاس ہیں۔ یہ کہانیاں نہ تو کسی چودہ سو سالہ قدیم تہذیب کی بازیافت اور نہ ہندو دیومالائی کہانیوں کا نیا روپ۔ یہ

کہانیاں نہ صرف اپنے عصری ماحول تہذیب و ثقافت اور معاشرت کی عکاس ہیں بلکہ ان کے کردار اور زبان و واقعات ان کی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہر کہانی اپنی ہی تہذیب سے پھوٹتی ہے اور نمو پاکر ان دیکھی تہذیبوں کی عکاس بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کی کہانیاں قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی نسل کی بے چینی سیاسی و معاشرتی منظر نامے کے ساتھ، ترقی یافتہ ممالک کی تہذیب و معاشرت کو اُجاگر بھی کرتی ہیں۔

ان افسانوں کے اندر جدید انسان کی اپنی تہذیب و ثقافت اور روایات سے جذباتی تعلق کی محرومی اور سماجی و معاشی جبر کی بدولت فرد کے بڑھتے ہوئے احساس تنہائی، داخلیت پسندی بے حسی اور لاتعلقی ابھر کر سامنے آئی ہے۔ جس کے پس پردہ معاشی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی و نفسیاتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ یوں یہ کہانیاں پاکستانی معاشرت و سیاست اور عصری صورتحال کی دستاویز بن جاتی ہیں۔

یہ کہانیاں انوار احمد کو اردو کی افسانوی روایت میں نئے موضوعات اور تکنیک کی سطح پر منفرد تجربات کے حامل کہانی کار کے طور پر شناخت کراتی ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آسٹر وٹرف، آخری خط، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء ص ۷۶

۲۔ پہلا محب وطن بچہ، ایضاً، ص ۲۳

۳۔ جب راج کرے گی خلق خدا، ایضاً، ص ۱۱۵

۴۔ کمال بستی جبڑا چوک، ایضاً، ص ۶۶

۵۔ آخرت ایکسپریس، مشمولہ پہلے سے سنی ہوئی کہانیاں، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۳ء ص ۱۰۷

۶۔ گرجھووالی سرکار، آخری خط، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء ص ۹۷

۷۔ جب راج کرے گی خلق خدا، ایضاً، ص ۱۱۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۹۔ درد داں دی ماری دلڑی علیل اے، ایضاً، ص ۵۹

۱۰۔ اصغر ندیم سید، کہانی کار اور کہانی کی کہانی، مشمولہ پہلے سے سنی ہوئی کہانیاں،بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۳ء ص ۲۰

۱۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، نوں جی، آخری خط، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء ص ۱۹

۱۲۔ گونگی غراہٹ، مشمولہ پہلے سے سنی ہوئی کہانیاں، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۳ء ص ۹۲

۱۳۔ ڈاکٹر دل محمد اور دردِ دل، آخری خط، ایضاً، ص ۱۰۹

۱۴۔ نئی دنیا کی تلاش، ایضاً، ۱۵۹

۱۵۔ گرجھو والی سرکار، ایضاً، ص ۸۳

۱۶۔ ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۵۰

۱۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء ص ۱۵۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۵

مہناز انجم
اسکالر پی ایچ۔ڈی،اُردُو،منہاج یونی ورسٹی، لاہور

# نصیر احمد ناصر کی نظموں میں جدید دور کے مسائل

## Issues of modern times in the poems of Nasir Ahmad Nasir

The poetry of Naseer Ahmad Nasir is the quintessence of his deep observation and experience. Terminology of Science and words related to engineering are a part of his diction.The present day man is facing a lot of problems. Pakistan has suffered a lot after the world Trade Center attack. As a result of terrorist activities, we have seen the loss of thousands of innocent lives. Moreover, industrial and technological development has devastated the beauty of Nature. In his poems Naseer Ahmad Nasir has highlighted these problems in a forceful and effective manner. He raises his protesting voice against multifaceted human attitudes. He protests against those who violate the human rights. He is an ardent supporter of human equality, sympathy, kindness and justice. He is against all types of terrorism, exploitation and injustice. In short, the diction, style, metaphors and imagery of Naseer Ahmad Nasir contributes a lot in forming the Modern Urdu Poem.

**Key Words:** *Prose Poem, Partition of Sub-continent, Comparative Study, Commonalties, Dissimilarities*

اسّی کی دہائی میں جن نظم نگاروں نے اپنی شناخت بنائی،اُن میں نصیر احمد ناصر ایک اہم نام ہے۔"دسمبر اب مت آنا"،نصیر احمد ناصر کا اوّلین مجموعۂ کلام ہے۔یہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اِس کے بعد آزاد نظموں پر مشتمل اُن کے چار مجموعے"عرابچی سو گیا ہے"، "پانی میں گم خواب" اور "ملبے سے ملی چیزیں" اور "سرمئی نیند کی بازگشت" شائع ہو چکے ہیں۔نصیر احمد ناصر نے ہائیکو پر بھی طبع آزمائی کی اور اُن کا اس صنف پر مشتمل مجموعہ "زرد پتّوں کی شال" کے نام سے منظرِعام پر آ چکا ہے۔ نصیر احمد ناصر کے ہائیکوز کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے ہے کہ"اپنے ہائیکوز میں نصیر احمد ناصر نے برہنہ فطرت کے اس کینوس پر ان کرداروں کو اس طور اُبھارا ہے کہ وہ انسانی محسوسات کی آئینہ داری کرنے لگتے ہیں۔"(۱)

نصیر احمد ناصر نے غزل، آزاد نظم اور ہائیکو کے علاوہ نثری نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے"تیسرے قدم کا خمیازہ"اور" سر مئی نیند کی بازگشت" اُن کی نثری نظموں پر مشتمل مجموعے ہیں۔نصیر احمد ناصر نے "تسطیر" جنوری ۱۹۹۸ء میں لکھے گئے اداریے میں بعض ترامیم کر کے اسے "تیسرے قدم کا خمیازہ" کے ابتدائیہ میں بعنوان "نثری نظم کا تخلیقی جواز" شامل کیا ہے۔اس ابتدائیہ میں اُن کا کہنا ہے کہ "اُردُو نثری نظم ساٹھ اور ستر کی دہائیوں پہ مشتمل اپنے عبوری دورانیے(دورِ اوّل) سے گزر کر اب اس مقام پر ہے جہاں اس کے"ماخذات"اور اس میں "اوّلیت" جیسے نزاعی معاملات ضمنی نوعیت کے رہ جاتے ہیں اور "تخلیقیت" زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔"(۲)

انسانی معاشرہ آفاقی اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ خطے اور علاقے کے حوالے سے بھی منفرد تہذیب اور مسائل کا مظہر ہوتا ہے۔اسی طرح تخلیقی فنون بھی انفرادی اور اجتماعی نفسیات اور مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔نصیر احمد ناصر کا تعلق جہلم سے ہے۔جہاں بارانی زمینیں ہیں اور بارانی لوگوں کا المیہ یہ بھی ہے کہ بارشوں کی کمی کی وجہ سے انھیں زمین اور کاشت کاری سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔دفاتر میں زمینوں کی ملکیت اور ٹیکس وغیرہ کے حوالے سے الگ خواری ہوتی ہے۔اس کے با وجود یہ لوگ تمام مسائل برداشت کرتے ہیں اور مٹی سے جڑے رہتے ہیں۔ان مستقل مزاج بارانی لوگوں کی عکاسی وہ یوں کرتے ہیں:

ہم بارانی لوگ ہیں /ہم جانتے ہیں /وہ ہمیں کاغذوں کی مار ماریں گے /رپٹوں
اور مسلوں میں گھسیٹیں گے /وہ ہماری بے ضرر حرکات و سکنات پر ٹیکس لگا
دیں گے /ہمیں دفتروں، تھانوں، کچہریوں کے پھیرے لگوا لگوا کر /ایک دن
داخلِ دفتر کر دیں گے /لیکن وہ نہیں جانتے ہم بارانی لوگ ہیں۔(۳)

نصیر احمد ناصر کی شاعری تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ نظر آتی ہے۔اُن کی شاعری کی لفظیات میں سائنسی اصطلاحات اور انجینئرنگ سے متعلقہ الفاظ کا استعمال اُن کی اِن علوم سے براہِ راست آگہی کا نتیجہ ہے۔اُن کی ابتدائی شاعری میں رومانوی انداز کے ساتھ ساتھ فطری علامتوں کا استعمال ملتا ہے۔ خصوصاً ان کے مجموعے "پانی میں گم خواب" میں ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے آرزوؤں،

خواہشوں اور خوابوں کا ایک وسیع سلسلہ ملتا ہے۔بقول احتشام علی ''نصیر احمد ناصر کی نظم نگاری کے منظر نامے میں فطری علامتوں کے ساتھ رومانیت کی رو بھی ایک وسیع تناظر میں اپنا ادراک کراتی ہے۔"(۴)

گزشتہ پچیس تیس برسوں میں ملکی منظر نامے میں اندرونی اور بین الاقوامی واقعات نے بھی ملکی سیاست، معاشرت اور ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا ہے۔خصوصاً ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد پاکستان میں دہشت گردی کی آنے والی لہر اور اِس کے نتیجے میں بے گناہ اور معصوم لوگوں کی جانوں کا ضیاع ایک اہم مسئلہ ہے۔اسی طرح مشینی ترقی اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے فطری حسن کی تباہی بھی آج کا مسئلہ ہے۔تیسری دُنیا کے مسائل اور بڑی طاقتوں کے سامنے ان کی کم مائیگی کا مزاحمتی رویہ جہاں اُردُو ادب کی دیگر اصناف کو متاثر کرتا ہے، وہیں یہ عصری حسیت نظم نگاروں کے موضوعات میں بھی در آئی ہے۔

نصیر احمد ناصر کی نظم بھی معنی اور فکری حوالے سے اپنے عہد کے انھی مسائل اور رویّوں کی نشان دہی کرتی ہے۔مثلاً اُن کی یہ نظم ملاحظہ ہو:

شہر بھر میں /فائرنگ، زخمی، دھماکے، سائرن/ شعلے/ دھوئیں کے آبنوسی دائرے/ جلتے تناظر/ آگ میں لپٹی کتابیں / لائبریری کی عمارت/ میوزیم/ تصویر کی آنکھوں میں آنسو/ سلسلہ در سلسلہ سہمی ہوئی/ اطراف میں / اعضا بریدہ زندگی/ سرگشتگی افکار کی، غارت گری الفاظ کی/ تازہ لہو تاریخ کے اوراق پر ..... (۵)

نصیر احمد ناصر کے پہلے مجموعے میں شامل نظمیں اکہری سطح پر مفہوم ومعنی کی ترسیل کرتی ہیں۔لیکن علائم واستعارات کا نظام اس میں کثیر الجہتی نہیں ہے۔ان کی بعد میں آنے والی نظمیں اپنے عہد کے علامتی اور تمثالی رویّے کو زیادہ بہتر انداز میں منعکس کرتی ہیں اور یہ ذہنی ارتقااُن کے مجموعے"عرابچی سو گیا ہے'' کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ایک نظم ملاحظہ ہو:

غبارے کے پیچھے/ بہت دور بھاگا/ مگر تھک گیا وہ/ غباراہوا سے بھرا تھا/ حقیقت میں لیکن ہوا سے بھی ہلکا تھا/ اڑتا ہوا/ بادلوں سے بھی اوپر نکلتا چلا

جا رہا تھا/ ذرا دیر میں پھر/ نگاہوں کی حد سے بھی اوجھل ہوا تھا/ مگر اپنی
معصوم سوچوں کی چھت پر/ ابھی تک/ وہ نادیدہ دھاگے کو تھامے کھڑا
ہے/ زمیں اک غبارے کی صورت/ خلا میں اڑی جا رہی ہے۔(٦)

نصیر احمد ناصر کے ہاں دوغلے انسانی رویّوں کے خلاف احتجاج اور حقوق انسانی کو تہس نہس کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں سے کیمیائی اور ایٹمی میزائل اور نہ جانے کون کون سے بم ایجاد کرنے والوں کے خلاف احتجاجی رویّہ ملتا ہے۔قدرت نے شاعر کا خمیر درد اور محبت کی آمیزش سے اٹھایا ہے، اسی لیے تو وہ "سارے جہاں کا درد" اپنے جگر میں محسوس کرتا ہے۔یہی جذبۂ محبت کسی بھی شاعر کے اندر انسانی مساوات، ہمدردی، رحم دلی اور انصاف کے جذبات کو اُبھارتا ہے۔وہ خوش حالی کے دنوں میں خوشی کے نغمے بھی لکھتا ہے،لیکن اپنے اردگرد ناانصافی، جبر وستم، استحصال اور زیادتی دیکھ کر سراپا احتجاج بھی بن جاتا ہے۔وہ انسانیت کو روتا بلکتا نہیں دیکھ سکتا۔ایسے میں اُس کی انصاف پسند رُوح ایسے میں تڑپ اٹھتی ہے اور تخلیقی سطح پر وہ کبھی نظم اور کبھی غزل بن کر سامنے آتی ہے۔

جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو بے شمار فائدے پہنچائے ہیں، لیکن تصویر کا ایک دُوسرا رُخ بھی ہے جو بہت بھیانک اور خوف ناک ہے۔نصیر احمد ناصر تصویر کا یہی دُوسرا رُخ دِکھاتے ہیں۔ان کی نظم "پانی میں گم خواب" کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

جوہری نظاموں میں / نام بھول جاتے ہیں / کوڈ یاد رہتے ہیں / ایٹمی
دھماکوں سے/ تابکار نسلوں کے/ خواب ٹوٹ جاتے ہیں / شہر ڈوب جاتے
ہیں / مرکزے بکھرتے ہیں / دائرے سمٹتے ہیں / رقص کے تماشے
میں(٧)

رفیق سندیلوی نصیر احمد ناصر کے سائنسی موضوعاتِ نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"نصیر احمد ناصر نظم کے رمز آشنا شاعر ہیں۔ان کا میدانِ معنٰی خاصا وسیع
ہے، اہم بات یہ ہے کہ وہ اس آگہی کو بھی ایک موزونی کے ساتھ نظم کے

دھاگوں میں حرکت کرنے دیتے ہیں جو انہیں سائنسی اکتشافات سے مہیا ہوتی ہے۔" (۸)

نصیر احمد ناصر کے ہاں انگریزی الفاظ کا استعمال نظموں کے عنوانات اور متن میں ملتا ہے مثلاً "لائٹ ہاؤس"، "بلیو مون"، "بک مارک"، "سٹی ہائٹس"، "ویپ ہولز"، "بلیک وڈو"، "باسٹرڈز"، "گلاس ہاؤس"، "وال چاکنگ"، "Snapshot"، "آرکیالوجی"، "ناسٹیلجیا" وغیرہ اُن کی نظموں کے عنوان ہیں اور یہی صورت اُن کی نظموں کے متن میں بھی نظر آتی ہے؛ لیکن یہ الفاظ ہم عصر زندگی اور جدید حسیت کو واقعیت اور جامعیت کے ساتھ گرفت میں لینے اور پیش کرنے کے لیے کہیں علامت بن کر آئے ہیں اور کہیں استعارے کی صورت میں آئے ہیں مثلاً "گلاس ہاؤس" کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

یہاں رات آتی ہے لیکن/ کوئی خواب لاتی نہیں ہے/ یہاں دھوپ چڑھتی ہے لیکن/ کسی کو جگاتی نہیں ہے/ یہاں پھول کھلتے ہیں لیکن/ ہوا گیت گاتی نہیں ہے! (۹)

جہاں تک نصیر احمد ناصر کی زبان کا تعلق ہے تو اُنھوں نے فارسیت سے تو دامن بچایا لیکن ہندی تراکیب کا استعمال اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ نصیر احمد ناصر کے اُسلوب اور لفظی اختراع پسندی کی روِش کے بارے میں ڈاکٹر فہیم اعظمی کہتے ہیں:

"ان نظموں کی سب سے بڑی صفت زبان کا فن کارانہ استعمال ہے جو منطقی ہوتے ہوئے برجستگی اور معنویت کا بھرپور تاثر دیتی ہے۔ شاعر نظموں کے عنوان، موضوع، متن اور اس کے برتنے میں بڑے تنوع اور اختراع پسندی سے کام لیتا ہے۔" (۱۰)

نصیر احمد ناصر کی نظم اپنے اُسلوب، لفظیات، تراکیب اور استعاروں کے حوالے سے جدید اُردُو نظم کی تشکیل میں اپنا الگ حصہ ڈالتی ہے۔ بالخصوص ناصر کی امیجری اتنی تازہ اور تمثالیں اتنی بھرپور ہیں کہ غزل کی شاعری کرنے کے باوجود اُنھوں نے انھیں روایت سے متاثر نہیں ہونے۔ "Weep Holes" کا یہ منظرملاحظہ ہو:

ہوا پتوں کا رستہ دیکھتی ہے/ بے شجر سڑکوں پہ پولی تھین کے خالی لفافے
سرسراتے ہیں / خود اپنے موسموں کا خون پی کر/ لوگ جرثوموں کی
صورت پل رہے ہیں / تابکاری کے الاؤ جل رہے ہیں / بدنمائی کے دھوئیں
سے/ پھول کالے، تتلیوں کے پر سلیٹی ہو چکے ہیں / خواب کا چہرہ /دباؤ
سے بگڑ کر ٹوٹ جائے گا/ نمی کو راستہ دو!/ درد کے بادل برسنے دو!/ زمین
پر آسماں کا دکھ اترنے دو!! (۱۱)

وہ موجودہ عہد کے مسائل اور رویّوں کو ماضی بعید کے انسانی رویّوں اور مسائل کے ساتھ بھی جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"دھند کے اس پار" اِس کی ایک مثال ہے۔شاید لاشعوری طور پر وہ اپنے عہد کے مسائل کے حل کے لیے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ اِس صورتِ حال میں اِن مسائل کا حل اُس وقت کیا نکالا جاتا تھا، لیکن اُنھیں قدیم اور جدید میں مماثلت نظر آتی ہے۔تب بھی کمزور اور محکوم کا استحصال ہوتا تھا اور آج بھی ہو رہا ہے۔صرف طریقۂ واردات بدل گیا ہے۔اِسی طرح کے موضوعات اُن کی مختلف نظموں مثلاً"ڈسٹ بن سے جھانکتی موت"،"اِن فوکس"، "آزوقہ"، "گدھے پر سواری کا اپنا مزا ہے"، "میں اندھیرے میں اُگی مشروم ہوں"، "الغیاث" اور "اناپ" میں بھی نظر آتے ہیں۔

سماجی حوالے سے نصیر احمد ناصر انسان کی روز مرہ زندگی کی تیزی اور اِس کی مصروفیت میں فرصت کے چند لمحات، تازہ ہوا کے جھونکے اور مناظرِ فطرت کو انسانی ضرورت سمجھتے ہوئے نظم "کھڑکیاں" تخلیق کرتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا اپنے ایک مکتوب بنام نصیر احمد ناصر میں "کھڑکیاں" کو بے حد خوب صورت نظم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " آپ جدید نظم کے پارکھ اور نباض ہی نہیں،اس کے ذریعے کھڑکیوں کو کھولنے اور ان کے پیچھے کے منظرنامے کو دیکھنے پر بھی قادر ہیں۔ہمارے اکثر نظم گو شعرا تو دیواروں سے ٹکریں مارتے

رہ جاتے ہیں۔ ایسی خوب صورت نظم لکھنے پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔" (۱۲)

نصیر احمد ناصر کے نزدیک اس مصروف زندگی کی وجہ انسان کو موت کی طرف جانے کی جلدی ہے۔ نظم " مرگ پیچ" میں نصیر احمد ناصر حسن فطرت کی تباہی، درختوں کے کٹاؤ اور کھیتوں کھلیانوں کی بربادی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔قدرتی حسن کی یہ پامالی موجودہ مادی ترقی، پھیلتے شہروں اور سڑکوں کے جال پھیلنے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ وہ فطری حسن کو زمین کا ایک خواب گردانتے ہیں جو دھرتی ماں نے اپنے بچوں یعنی انسان کے لیے دیکھا تھا۔

زمیں ماں ہے/ ہر اک ماں کی طرح/ تخلیق سے پہلے ہی بچوں کے لیے/
سرسبز خوابوں کی ردائیں بنتی رہتی ہے/ خود اپنی کوکھ کے شاداب ریشوں
سے/ کئی رنگوں کے مخمل، ریشمی موزے، سوئٹر، ٹوپیاں، کپڑے/ گھنی گہری
منا جاتیں، دعائیں بنتی رہتی ہے/ زمیں نے خواب دیکھا تھا، یہ سوچا تھا/
جواں ہو کر/ میں جب پھولوں پھلوں گا تو/ مری خوشبو سے چہکیں گے
تنفس موسموں کے/ ذائقے میرے پھلوں کے نام سے منسوب ہوں گے/
شاخچوں پر دھوپ چمکے گی/ پرندے آشیانوں سے نکل کر گیت گائیں گے/
پروں کو گدگدائیں گے (۱۳)

اپنی ایک اور نظم "مہمان پرندوں کو الوداع" میں بھی نصیر احمد ناصرنے ماحولیاتی آلودگی اور کثافتوں سے سرسبز زمین کو پہنچنے والے نقصان کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔اس نظم میں اُنھوں نے زمین کا سینہ چیرتی سیاہ تار کول کے باعث زمینی حسن کے گہنا جانے کو موضوع بنایا ہے۔"ویپ ہولز"، "وقت کے بدرو میں گرتے خواب"، "ایک نیا اطلاعتہ گم ہونے والا ہے" وغیرہ میں بھی شاعر نے ایسے ہی احساسات کا ذکر کیا ہے۔

معاشرے اور کائنات کے مسائل کے علاوہ عورت کے کردار کو بھی نصیر احمد ناصر نے اپنے منفرد زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ عورت اور محبت کے ضمن میں اُن کی نظموں میں موجود رویّوں کے حوالے سے پروین طاہر لکھتی ہیں:

"عورت اُس کے ہاں خواہ بیٹی ہو، ماں ہو، یا پھر محبوبہ، خدا کا رُوپ ہے، کومل ہے، روشنی زادی اور سراپا محبت ہے، کہیں وہ اس سے روشنی کے لمس کا دان مانگتا نظر آتا ہے تو کہیں اس کے دُکھ سن کر بے تحاشا رو دیتا ہے۔اُس کے ہاں عورت کا درجہ الوہی ہے"۔ (۱۴)

نصیر احمد ناصر نے خود اپنی ایک نظم میں عورت کے تصور کی وضاحت کی ہے۔

تو ہر تہذیب کا حصہ ہے/ تو ہر دور کا قصہ ہے/ صدیوں کی امانت ہے/
زمیں پر پیار کی پہلی بشارت ہے/ خدا کا گیت ہے/ ہر عہد کی عورت ہے تو
..... لیکن/ تجھے کس عہد میں ڈھونڈوں؟ (۱۵)

نصیر احمد ناصر اپنے عہد کے سیاسی حالات کو اپنی نظم "تیسری دنیا" میں بیان کرتے ہیں۔وہ عالمی طاقتوں کے ہاتھوں تیسری دُنیا کے استحصال اور پس ماندگی کا ذکر کرتے ہیں۔"گمشدہ نسلوں کی لوری" میں بھی آمرانہ حکومت، کرفیو، ہجرت اور جنگ کے نتیجے میں مرنے والوں کی نسلوں کی نیند اُڑانے کا ذکر ملتا ہے۔"آزوقہ" میں بھی نصیر احمد ناصر نے سرخ سیاست اور زرد معیشت کا ذکر کیا ہے۔ ایک زمین کے ٹکڑے کے لیے سیاسی چالوں اور زمین زادوں کی زندگی میں پائے جانے والے دھکے اور آنسوؤں کی منظر کشی کی گئی ہے۔

ایک گلوب کے شہری سارے/ بھوکے ننگے پیاس کے مارے/ سرخ سیاست
زرد معیشت ڈھلتی عمریں، چڑھتے بھاؤ/ آنسو آہیں، غم اور گھاؤ/ ایک زمین
کے ٹکڑے سے بھی/ کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے! (۱۶)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ نصیر احمد ناصرنے اپنی شاعری میں انسان کے ہاتھوں ہونے والی تباہی کو موضوع بنایا ہے۔اُنھوں نے جبرواستحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ جدید ترین مہلک ہتھیاروں کے

نقصانات پر قلم اُٹھایا ہے۔صنعتی ترقی اور مشینوں کی فراوانی کے باعث انسا ن کی فطرت سے دُوری بھی اُن کی نظموں کااہم موضوع ہے۔آلودگی کی وجہ سے فطرت کے ماند پڑتے حسن کے مسئلے کو بھی اُنھوں نے اُٹھایا ہے اور یہ سب کچھ ایک خوب صورت اور دل کش انداز میں کیاہے۔اُن کی نظمیں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور اُسے سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا: "معنی اور تناظر"، انٹرنیشنل اُردُو پبلی کیشنز، دریا گنج نئی دہلی ۲۰۰۰ء ص : ۳۰۷

۲۔ نصیر احمد ناصر" نثری نظم کا تخلیقی جواز" مشمولہ"تیسرے قدم کا خمیازہ" سانجھ پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۳ء ص: ۱۴

۳۔ نصیر احمد ناصر: "سرمئی نیند کی بازگشت" بک کارنر، جہلم ۲۰۱۷ء ص: ۱۹

۴۔ احتشام علی:"جدید اُردُو نظم میں عصری حسیت"،سانجھ پبلی کیشنز لاہور ، ۲۰۱۵ء ص: ۲۱۶

۵۔ نصیر احمد ناصر: "پانی میں گم خواب" تسطیر پبلشرز راول پنڈی ۲۰۰۲ء، ص: ۱۲۴۔۱۲۵

۶۔ نصیر احمد ناصر: "عرابچی سوگیا ہے" تسطیر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۳۴

۷۔ نصیر احمد ناصر: "پانی میں گم خواب" سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۲۸

۸۔ رفیق سندیلوی: "اُردُو نظم کے پچاس سال" مشمولہ "اوراق" (جدید نظم نمبر) جولائی، اگست ۱۹۹۷ء ص:۸۳

۹۔ نصیر احمد ناصر: "پانی میں گم خواب" تسطیر پبلشرز، راول پنڈی ۲۰۰۲ء، ص ۶۶

۱۰۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی:" خواب، سفر اور فطری مظاہر کا شاعر"، مشمولہ" اوراق" ، لاہور، جولائی اگست۱۹۶۹ء، ص: ۴۷

۱۱۔ نصیر احمد ناصر:" عرابچی سو گیاہے" سانجھ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص:۵۳

۱۲۔ وزیر آغا: "وزیر آغا کے خطوط، نصیر احمد ناصر کے نام" مشمولہ "تسطیر" لاہور جنوری تا جون ۲۰۱۱ء، ص ٦٨

۱۳۔ نصیر احمد ناصر "عرانجی سو گیا ہے" محولہ بالا ص: ۴٦۔۴۷

۱۴۔ پروین طاہر "عرانجی سو گیا ہے"، غیر مطبوعہ مضمون

۱۵۔ نصیر احمد ناصر" عرانجی سو گیا ہے" سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء ص: ۱۱۴۔۱۱۵

۱٦۔ نصیر احمد ناصر : " ملبے سے ملی چیزیں" سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص:۴٦

عثمان غنی رعدؔ
استاد شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد
محمد ابرار صدیقی
ایم فل اسکالر، نمل اسلام آباد

# سیرت "رسولِ صادقؐ" کا تجزیاتی مطالعہ

## An analytical study on biography: Rasul e Sadiq

The Prophet Muhammad (PBUH) is a very important and beloved personality in the whole world. There fore this is a very rewardable work to write down the biography of Him, but it's also a responsible deed. This biography Rasul e Sadiq is a compilation of Allam Mashriqi's essays. In this article an analytical study would be present that how much compiler is successful in this compilation, but study is showing that compiler is not achieving the possibilities. Because compiler is not rationalized the name of book when he was selecting the essays. Its proof that this is a very difficult work to compile a biography with the help of different essays.

**Keywords:** *Beloved, Personality, Rewardable, Biography, successful, Possibilities.*

حضرت محمد ﷺ دنیا کی مقبول ترین اور پسندیدہ شخصیت ہیں اور آپ ﷺ دنیا کی صفِ اول کی متاثر کن شخصیت بھی ہیں۔ دنیا کا اصول ہے کہ اہم ترین لوگوں کی سیرت و سوانح کو جمع کیا جاتا ہے تا کہ بعد میں آنے والے لوگ ان کی زندگیوں سے سبق حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکیں۔ اسی لیے آپ ﷺ کی زندگی پر عرب و عجم میں برابر لکھا جاتا رہا ہے اور آج بھی مختلف پہلوؤں کے حوالے سے لکھا جاتا ہے اور آگے بھی لکھا جاتا رہے گا۔ شاید ہی دنیا کی کوئی زبان ہو گی جس میں آپ ﷺ کی زندگی اور سوانح کے بارے میں نہ لکھا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے بارے میں دنیا کا ہر شخص علم رکھتا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کے بارے میں لکھنا نہ صرف ایک ثواب اور جزا کا کام ہے بل کہ ایک انتہائی اہم ذمے داری بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان و غیر مسلم ہر کوئی آپ ﷺ کی زندگی پر قلم اٹھانے سے پہلے نہایت عقیدت کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید میں بھی حاذقانہ رویہ اپناتا ہے نہیں تو اس

نازک معاملے میں جزا کے بجائے سزا کا بھی احتمال رہتا ہے۔اس مضمون میں علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کی سیرت "رسولِ صادق" کا تجزیہ پیش کیا جائے گا مگر اس سے قبل مصنف موصوف کے بارے مختصر جان لینا چاہیے۔

علامہ عنایت اللہ خان المشرقی ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امر تسر، پنجاب برٹش انڈیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کو ریاضی سے غیر معمولی شغف تھا اور اسی میں نابغہ مانے جاتے تھے۔ آپ کے قائم کیے گئے ریکارڈز کو آج بھی کوئی نہیں توڑ سکا۔ بہ یک وقت ماہرِ ریاضی دان، ماہرِ فزکس، عربی و فارسی کے عالم، قرآن کے شارح مفسر اور انڈین سول سروسز کے درجے کے بیوروکریٹ تھے۔ان سب باتوں اور اعزازات کے باوجود وہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر دن رات کڑھتے رہتے تھے اوران کی بہتر حالت کے لیے کوشاں تھے اسی لیے انھوں نے ایک سیاسی جماعت بھی بنائی جس کا نام "تحریکِ خاک سار" رکھا۔ جس کے جھنڈے تلے انھوں نے پسے ہوئے مسلمون طبقے کو اکٹھا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ آپ کی علمی و سیاسی قیادت و قابلیت کو اک نظر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایم۔اے ریاضی (پنجاب)، ایم۔اے ریاضی (کنٹبرے)، بی۔ایس۔سی، بی۔او۔ایل، ایف۔آر۔ایس۔اے، ایف، بی، ایس (پیرس)، ایف، پی، ایچ، آئی، آئی۔ای۔ایس، فاؤنڈیشن اسکالرز، بیچلر اسکالر رینگلر، چار عدد فرسٹ کلاس ٹرائی پوس، بانی خاک سار تحریک، بانی اسلام لیگ، بانی ہیومن موومنٹ، ممبر انٹر نیشنل کانگریس آف اورئینٹلسٹ (لیڈن)، چیف ڈیلی گیٹ موتمر خلافتِ قاہرہ، پریزیڈنٹ ورلڈ فیتھس کانفرنس اندور اور ایف۔ایس۔اے (پیرس) وغیرہ وغیرہ۔[1]

آپ نے ۲۷ اگست ۱۹۶۳ کو لاہور میں وفات پائی۔ آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے جنازے میں دس لاکھ سے زائد لوگ شامل تھے۔

آپ نے مذہبی اور سیاسی مقبولِ عام کتابیں تصنیف کیں مگر سب سے زیادہ شہرت آپ کی کتاب "تذکرہ" کو حاصل ہوئی جو نوبل انعام کے لیے بھی نامزد ہوئی اور ایک کتاب سیرت پر "سیرت النبی ﷺ" کے عنوان سے لکھی جو کلامِ ربی سے محبت کے موتی چن کر ایک مالا بنائی گئی ہے۔ متذکرہ کتاب "رسولِ صادق ﷺ" جس کا ابھی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے یہ کتاب مصنف موصوف نے باقاعدہ سیرت کے طور پر تحریر نہیں کی مگر غلام قدیر خواجہ (جو علامہ مشرقی پر تخصص رکھتے ہیں) نے اس کتاب کو مرتب کرنے میں علامہ مشرقی کے قلم سے لکھے

چند مضامین کو اس انداز سے اکٹھا کر دیا ہے کہ یہ بھی سیرت کی کتاب بن گئی ہے۔اسی لیے اس کتاب کا جائزہ لیا جائے گا کہ اس کتاب کو مرتب موصوف کس حد تک سیرت کی کتاب بنا سکے ہیں۔

اس کتاب کو مرتب نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔جن کے نام بالترتیب یہ ہیں:رسولِ صادق ﷺ،وحی، خدا،انسان،صحیفہ ء فطرت،صلائے عام بہ ساکنانِ زمین،نگہِ بازگشت۔انھیں ابواب کے تناظر میں مرتب نے مصنف کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کر کے ایسے مضامین جمع کیے کہ وہ ایک سیرت کا روپ دھار لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان مضامین کی ترتیب بھی ایک اہم کام تھا۔جس میں مرتب قدرے کامیاب ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

پہلے باب میں رسول ﷺ کے صادق ہونے پر یقین رکھنے ہی کو کامیابی کی ضمانت قرار دیا گیا ہے اور حضور ﷺ ایک محرک بالذات شخصیت ہیں کہ جب تک مسلمان قوم اس بات پر متفق رہی اس وقت تک پوری دنیا میں مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہا ہے اور آج بھی کوئی بھی مسلمان جو اسلام کے ابتدائی حالات سے واقف ہے وہ اس بات کی سچائی سے بخوبی واقف ہے۔علامہ لکھتے ہیں:

> "نااہلیت اور غیر صالحیت کی تعریف بھی ہمیشہ سے ہر وجود کے متعلق یہ رہی ہے کہ وہ وجود اس وقت نا اہل ہو جاتا ہے جب اس کے اندر محرک کا زور ماند پڑ جائے۔دینِ اسلام کا محرک بالذات پہلے دن سے محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سچا ہونے پر یقین تھا۔"(۲)

اس باب میں مؤلف نے جن پہلوؤں کو علامہ کے مضامین میں تلاش کیا ہے ان میں رسولِ صادق ﷺ کی تکمیل کے لیے کائناتِ فطرت کی پہلی حقیقت کا اعلان بہ ذریعۂ وحی تھا جس میں اللہ نے اپنے محبوب ﷺ کو بتلایا کہ کائنات کے مناظر کو قلم کی حقیقت سے آشنا کر کے فطرتی انداز میں لوگوں کے سامنے اس کی معبودیت کو واضح کرے۔اسی لیے پہلی وحی میں قلم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔رسولِ صادق ﷺ کے سچے نبی ہونے کے لیے قرآن کا صادق ہونا ہی کافی ہے جس کے لیے مصنف موصوف نے قرآنی اسلوب،عبارت آرائی اور زورِ بیان کو حد درجے تک بیان کیا ہے۔اسی باب میں غیر مسلموں کی طرف سے الزامات کا جواب بھی ملتا ہے جس میں خاص کر

حضور ﷺ کے ذہنی توازن کا ذکر ہے تو مصنف موصوف نے مختلف لحاظ سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ ذہنی لحاظ سے مکمل تن درست تھے۔ اس کے تناظر میں لکھتے ہیں:

> "مدینے کی بخار کی وبا میں جو مسلمان مہاجروں پر پہلے برس آئی صرف رسولِ خدا ﷺ ہی بخار سے بچے رہے۔ وہ انتہائی شخصی جوانمردی اور شجاعت جو اس مردِ خدا نے غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ خندق، غزوۂ حنین، غزوۂ تبوک وغیرہ میں دکھائی، عرب کی شدید ترین اعصاب کش آب وہوا میں اس بہادر کی کامل دل جمعی، پوری صحتِ بدن، غیر معمولی اطمینانِ قلب اور تہوّر کے علاوہ انتہائی مضبوط اعصاب کے مالک ہونے کی زندہ مثال ہے۔"(۳)

مصنف موصوف نے اپنی طرف سے لفظ " امی " کی تشریح یہ کی ہے کہ اس سے مراد ان عربیوں سے امتیاز کرنا تھا جو اہلِ کتاب نہیں تھے۔ یہ مصنف کی اپنی تشریح ہے اور اسی کے تناظر میں انھوں نے ان شارح اور مفسرین کو غلط کہا ہے جو حضور ﷺ کو امی یعنی اَن پڑھ کہتے ہیں۔ اس طرح کا مضمون ایسی تالیفی سیرت میں اکٹھا کرنے سے ایک طرح کی تشنگی چھوڑ گیا ہے یعنی یہ باب زیادہ تفصیل کا متقاضی تھا۔ اگر مصنف موصوف نے اس طرح کا کوئی اور مضمون لکھا ہے تو اسے بھی یہاں نقل کر دینا چاہیے تھا یا پھر حاشیا یا تعلیقات درج کرنی چاہییں تھیں تا کہ تفصیلاً اس پر بات ہو جاتی۔ اسی باب میں مولف نے مصنف موصوف کا ایک مضمون بعنوان "رسول ﷺ کا پیغام کوئی مذہب نہ تھا" درج کیا ہے۔ اس مضمون میں بھی کافی تشنگی پائی جاتی ہے اور مصنف کا اپنا نقطۂ نظر بھی کھل کر سامنے آتا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم تسبیح، نماز، ذکر اذکار کے ساتھ جہاد کو بھی اپنالیں۔ کیوں کہ نبی محترم ﷺ نے بھی اپنے تئیس سالہ دورِ نبوت میں دنیا کو ایک میز پر اکٹھا کرنے کے لیے ایسا ہی کیا ہے۔ اس مضمون میں بھی حاشیے کی ضرورت تھی جو کہ مولف نے نہیں لکھا۔ اس سے آگے حضور ﷺ کی تحریک کو عالم گیر تحریک کہا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خدا کے برحق ہونے کو حضور ﷺ کی سچائی سے ثابت کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ہی کی بہ دولت بے مثال کردار کے حامل مسلمان پیدا ہوئے، اسلام، کائنات اور انسان کا باہمی ربط بڑے قرینے سے رکھا گیا ہے۔

دوسرے باب میں حضور ﷺ کی زندگی کو اپنا کر ہی دنیا پر غلبے کی نوید سنائی گئی ہے۔ اس باب میں وحی کی اہمیت کے ساتھ ساتھ عرب کے زمانۂ جاہلیت کے حالات اور نبوت کے بعد کے حالات کو بڑے ایجاز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس میں مکہ اور مدینہ کے اجمالی جائزے ملتے ہیں۔ آپ ﷺ کے پختہ عزم اور ارادے کو اپنا کر ہی مسلمان خدا کی طرف پلٹ سکتا ہے اور اس کی کامیابی خدا کی طرف پلٹنے ہی میں ہے۔ سب سے اہم بات جو مصنف موصوف نے کی وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی ساری زندگی سے ہمیں محنت اور مسلسل محنت کا درس ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "رسول ﷺ کی زندگی اعلانِ نبوت بل کہ احساسِ نبوت سے لے کر آخری دم تک ایک مسلسل ذہنی، اعضائی اور کرداری تگ ودو میں گزری تھی۔ اسی تگ ودو نے ان کو جسمی طور پر بھی تندرست رکھا اور ذہنی حیثیت سے مفکرِ اعظم کے درجے تک پہنچا دیا۔"(۴)

تیسرے باب میں مصنف موصوف نے خدا اور خدا کے متعلقات پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان کی دنیا میں روبہ زوال ہونے کی وجہ صرف خدا کو صحیح معنوں میں نہ سمجھنا ہے۔ اس لیے اس باب میں خدا کے مقام، خدا کے حقیقی تصور، اس تناظر میں قرآنی تشریحات، نظامِ کائنات کا متوازن ہونا خدا کی دلیل بتایا گیا ہے۔ اسی لیے مصنف کا دعویٰ ہے کہ اگر کائنات کے گوشے گوشے میں خدا موجود نہ ہو تو کائنات کا نظام بالکل نہیں چل سکتا۔ لکھتے ہیں:

> "اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک خدا ہر جگہ حاضر وناظر نہ ہو، فطرت کا یہ عظیم الشان کارخانہ ایک پل کیوں کر چل سکتا ہے؟"(۵)

اسی باب میں مصنف موصوف نے یہ دعویٰ بھی اپنے علم کی بنیاد پر کیا ہے کہ اگر مسلمان خدا، رسول ﷺ اور قرآن پر اس طرح یقین نہیں کریں گے جیسا کہ اس پر عمل کرنے کا حکم ہے تو یقیناً یہ ساٹھ کروڑ (اس وقت عالمِ اسلام کی تعداد اتنی ہی تھی) کی امت صفحۂ ہستی سے مٹادی جائے گی۔ اس باب کے آخر میں مولف نے مغربی تہذیب کی بیخ کنی کے بارے میں ایک مضمون علامہ کا درج کر دیا ہے جو بالکل بھی یہاں زائد معلوم

ہوتا ہے کہ اس جگہ پر اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس مضمون میں مغرب کی چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ مشرقی قوم کا ان سے بلاوجہ متاثر ہونے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

چوتھا باب انسان کے عنوان سے انسان اور انسان کے مقام پر درج کیا ہے یہ باب نہایت مختصر ہے جو خود میں ایک عیب کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ یہ کہ مولف نے جب یہ باب تالیف کرنے کی سوچی تو اتنا مختصر کیوں رکھا اور اگر انھیں دو صفحات کے علاوہ مصنف موصوف علامہ مشرقی نے اور کچھ بھی انسان اور انسانی عظمت کے بارے نہیں لکھا تو کیوں کر اتنے بڑے بڑے مذہبی اور سیاسی دعوے وہ اپنی کم علمی کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ حال آں کہ ایسا یقیناً نہیں ہے بل کہ یہ غلطی مولف کی ہے کہ وہ اس باب میں مصنف کے زیادہ نظریات کو اکٹھا نہیں کر سکا۔ اس باب کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسان اس زمیں پر اللہ کا خلیفہ ہے تو اسے اپنی عظمت کو جاننا چاہیے اور خود اپنے بارے بھی جاننا چاہیے۔ یوں رقم طراز ہیں:

> "کائنات کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے پہلی شے جو جاننے کے لائق ہے یہ ہے کہ انسان کا اس کائنات میں مقام کیا ہے؟"(٦)

پانچواں باب کائنات کے بارے میں ہے جسے مولف نے "صحیفہء فطرت" کے عنوان سے درج کیا ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کی مولف نے سیرت کے اندر اس باب کی کیسے گنجائش نکال لی ہے اور مزے کی بات ہے کہ اس باب میں سیرتی پہلو بھی مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ بل کہ مصنف کے قرآنی آیات کی تشریحات پر مبنی مضامین جو کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں، کو درج کر دیا ہے۔ اسی بات کے تناظر میں مولف موصوف نے مصنف کا وہ بھی مضمون نقل کر دیا ہے کہ اگر ہم کائنات کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن کو صحیح معنوں میں سمجھنا ہو گا جس کے لیے کس زاویہ ہائے نگاہ کی ضرورت ہے وہ مضمون بعنوان "قرآن کو سمجھنے کے لیے بلندیِ نگاہ کیا ہو؟" درج کیا ہے۔

چھٹا باب بعنوان "صلائے عام بہ ساکنانِ زمین" کے نام سے درج کیا ہے۔ یہ باب اس مراسلے کا لبِ لباب ہے جو علامہ مشرقی نے دنیا کے بیس ہزار مشہور سائنس دانوں کو بھیجا تھا۔ جس میں دنیا بھر کے سائنس دانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی تھی کہ وہ مغربی جمہوریت اور اشتراکیت کو چھوڑ کر اسلام کا فطرتی نصب العین عام کریں

تاکہ اس سے لوگوں کی زندگیاں بہتر ہوں۔ اس میں انھوں نے سائنس، مذہب، انبیاء کی تعلیمات، انسانی نظر کی کج فہمی، سرمایہ داروں کی بالا دستی کے نقصانات اور مذہب، رنگ، نسل کی تفریق کی وجوہات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس مضمون کی بھی اس سیرت میں کہیں جگہ نظر نہیں آتی۔ بل کہ علامہ نے خود اس میں لکھ دیا ہے کہ تمام انبیاء اللہ کی طرف سے ایک ہی پیغام لے کر آئے ہیں۔ حضورؐ کی تخصیص واضح نہیں کی۔ یہ مضمون اپنی اہمیت کے لحاظ سے اہم ترین مضمون ہے اور علامہ مشرقی کا ایک اہم ترین کارنامہ ہے مگر اس کتاب میں اس کی جگہ نہیں بنتی تھی یا کسی قدر حاشیے کی ضرورت تھی جس سے مولف موصوف نے صرفِ نظر برتا ہے۔

آخری اور ساتویں باب میں مصنف نے ایک بار پھر تمام انسانوں کو سوچنے کی دعوت دی ہے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں کامیابی کی بنیاد قرآنِ حکیم پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہے۔ فرماتے ہیں:

> "قرآنِ حکیم عالم آرا صداقتوں اور حقیقتوں سے بھری ہوئی ایک حیرت انگیز تصنیف ہے جس کا افقِ نظر اب بھی دنیا تمدن، عمران اور علم کے بڑے بڑے مرحلوں تک پہنچ چکی ہے، ہزاروں میل بلند وبالا ہے اور ابھی شاید ہزاروں برس اور بلند وبالا رہے گا۔"(۷)

اس کتاب کی تالیف میں مولف نے جو مضامین اکٹھے کیے ہیں وہ کتاب کے عنوان کے لحاظ درست نہیں اور یہ کوئی سیرت کی کتاب نہیں بن سکی۔ اس کتاب کے تجزیاتی مطالعے کے بعد ایک چیز یہ بھی سامنے آئی ہے کہ کسی اور کے لکھے مضامین کو اکٹھے کر کے سیرت کی کتاب کو ترتیب دینا ایک نہایت کٹھن کام ہے حالاں کہ مولف و مرتب کے سامنے سب سے پہلا نقطہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کتاب کو کیوں کر مرتب کرنا چاہ رہا ہے اور اگر وہ مقصد ہی حاصل نہ ہو تو ساری کاوش بے سود چلی جاتی ہے۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی کی علمی بصیرت میں کسی کو کوئی شائبہ نہیں مگر مولف و مرتب کہاں تک کامیاب ہوا ہے اس کا ذمہ خود مولف پر ہوتا ہے نہ کہ مصنف پر۔ مولف موصوف نے خود پیش لفظ میں کہا ہے کہ یہ کتاب اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ یہ ایک پوری تصنیف معلوم ہو مگر ایسا ممکن نہیں ہو سکا یعنی مولف و مرتب اس میں

کامیاب نہیں ہو سکے۔ہاں! اگر کتاب کا نام کچھ اور ہوتا تو شاید یہ ایک مکمل کتاب بن جاتی یا ہر باب میں درج ہونے والے مضامین کو حضور ﷺ کی زندگی سے جوڑا جاتا تو بھی کامیابی کے کچھ آثار واضح ہو سکتے تھے۔

## حوالہ جات


١۔ انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، مرتب: سید قاسم محمود، الفیصل ناشران، لاہور، ص ٧٢١

٢۔ المشرقی، علامہ عنایت اللہ خان، رسولِ صادق ﷺ، مرتب: غلام قدیر خواجہ، جنگ پبلشرز، لاہور، ٢٠٠٠ء، ص ٢٩

٣۔ ایضاً ص ٣٢

٤۔ ایضاً ص ٥٣

٥۔ ایضاً ص ٦١

٦۔ ایضاً ص ٦٧

ڈاکٹر صائمہ نذیر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
حامد محمود
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، نیشنل ہونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

# محمد طفیل کی خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کے عناصر

## Elements of humor and satire in Muhammad Tufail's Sketch Writing

Muhammad Tufail is considered to be one of the most prominent sketch writers of Urdu literature.His sketches portrait human respects, humanity, touching sense, sympathy, sincerity, charging and fitness. It also reflects high quality literary tastes. It is believed that Muhammad Tufail's sketches just a serious statement, but in reality in Muhammad Tufail's sketches, elements of humor are also found which make his writings more comprehensive, meaningful and makes it easier for expressing thoughts. As Muhammad Tufail sketchs satisfy the literary tastes, meanwhile it showsa clear importance of the specific genre of writing satire and humor. This article reviews the elements of satire and humor in his character sketches.

**Keywords:** *Considered, Prominent, Sketch, Literature, Potrait, Sympathy, Sincerity, Statement, Elements, Humor.*

اردو کے غیر افسانوی نثری ادب میں خاکہ نگاری سوانحی اصناف میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اردو رسائل کا ایک نیا دور شروع ہوا اور نئے مضامین اور موضوعات کی طرف ادیبوں کے قلم چلنے لگے تو جہاں افسانوی نثر میں تبدیلی آئی اور سوانحی ادب میں بوریت اور طوالت کو کم کرنے کی طرف ایک رجحان شروع ہوا۔ اسی دور میں اردو کی نئی اصناف نے ظہور پایا۔ رسائل و جرائد نے اپنی ضرورت کے تحت ان مختصر اصنافِ ادب کو فروغ دیا۔ یہی دور خاکہ نگاری کا ارتقائی دور ہے۔

اردو کے ادبی رسائل و جرائد میں ایک منفرد اور معروف نام "نقوش" کا ہے۔ دیگر ادبی اصناف کے ساتھ ساتھ اردو میں "نقوش" کا نام خاکہ و شخصیت نگاری کے فروغ میں بھی نمایاں ہے۔ "نقوش" کے مدیر کے ساتھ محمد طفیل نے جس صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی وہ خاکہ نگاری ہے۔ انھوں نے اس دور میں صنف خاکہ نگاری کا انتخاب کر کے فنی اصولوں کے مطابق برتا جب ادیبوں کی بہت کم تعداد اس طرف توجہ دے رہی تھی۔

خاکہ نگاری میں شخصیت کی خدوخال، مجلسی زندگی، کردار اور عادات و اطوار کو خاکہ نگار ایسے پیش کرتا ہے کہ اس فرد کی کی ایک مکمل اور متحرک تصویر قاری پر منکشف ہوتی ہے۔ مذکورہ اوصاف کا اظہار تبھی ممکن ہے، جب خاکہ نگار شخصیت سے گہرے مراسم اور تعلقات رکھتا ہو۔ سطحی تعلقات کی بنیاد پر شخصیت کا بہتر اظہار خاکے میں ممکن نہیں ہوتا۔

خاکہ نگار کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ کرتا ہے اور پھر خاکے کے فنی تقاضوں کے مطابق اسے اظہار کی صورت عطا کرتا ہے۔ خاکہ نگار کی قوت مشاہدہ تیز ہوتی ہے۔ خاکہ نگار فہم و ادراک رکھتا ہے۔ خاکہ نگاری میں شخصیت کے اہم اور منفرد پہلوؤں کا ہی اظہار ممکن ہے کیوں کہ خاکہ نگاری کا اہم عنصر اختصار ہے۔ خاکہ نگار واقعات اور مکالمات کے انبار میں سے ایسے واقعات اور مکالمات کو منتخب کرتا ہے جس سے شخصیت کی تصویر کم سے کم اظہار میں ہمارے سامنے آجائے۔ خاکہ نگاری میں شخصیت کا اجمال بیان ہوتا ہے، ایسا اجمال جو کل پر دلالت کرتا ہے۔ خاکے کے فنی لوازم میں یہ بھی شامل ہے کہ خاکے میں مزاح اور نکتہ آفرینی ہو۔ فرد کی شخصیت کا مجموعی تاثر اس کے خاکے سے بھی ابھرتا ہے۔ جیسے سنجیدہ شخصیت کا خاکہ بھی سنجیدہ ہوگا البتہ خاکے کے فن کا تقاضا ہے کہ اس میں شگفتگی، دلچسپی اور تسلسل بھی موجود ہو۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق: "خاکے کو دلچسپ بنانے کے لیے ہلکا مزاحیہ رنگ بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔" (۱)

محمد طفیل نے طنز کو حکمت میں سمو کر پیش کیا ہے۔ جس طرح حکیم کڑوی دوا کو شہد یا شکر میں ملا کر اسے خوش ذائقہ بنا دیتے ہیں، محمد طفیل نے ایک ادیب کی حیثیت سے معاشرے کی وہی خدمت انجام دی ہے۔ وہ تلخ رویوں، بدمزہ کر دینے والی عادتوں، ناقابلِ قبول کمزوریوں کو ایسے میٹھے طنز میں پیش کرتے ہیں کہ مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے اور بدمزگی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ انھوں نے اپنے اسلوب نگارش کے متعلق خود ہی لکھا ہے:

> "خاکہ نگاری کو حقیقت نگاری سے آنکھیں نہیں چرانا چاہییں لیکن اس کے پاس ایسا حکمت آمیز قلم ہونا چاہیے کہ وہ کہے سب کچھ، مگر اس ڈھب سے کے ہر قدم پر سُجھا سُجھا کے انجان بنتا چلا جائے۔" (۲)

محمد طفیل کے خاکوں کا بنیادی وصف معروضیت ہے۔ خاکہ نگاری کسی شخصیت کو حقیقی رنگ میں پیش کرتا ہے اور یہی وصف محمد طفیل کے خاکوں میں موجود ہے۔ گویا خاکہ نگاری کو احوالِ واقعہ یا مشاہدے کا بیان سمجھتے ہیں

اور بیان میں خود اپنی شخصیت کا بے جا دخل بھی انھیں پسند نہیں۔ ان کی تحریر مبالغہ، قصیدہ گوئی، ہجو اور بے جا منظر نگاری سے پاک معلوم ہوتی ہے اور یوں وہ ادب کے اعلیٰ معیار پر دکھائی دیتی ہے۔

محتاط طرز نگارش کے باعث یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ محمد طفیل کے خاکوں میں دلچسپی اور دلکشی کی بجائے سنجیدگی غالب ہوگی اور معروضیت کی وجہ سے تحریر بوجھل ہوگی، جس وجہ سے ایک عام قاری کو محمد طفیل کی خاکہ نگاری میں وہ لطف اور چاشنی محسوس نہیں ہو سکے گی جو خاکہ نگاری کی صنف کا خاصہ ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد طفیل کا اسلوب نہایت لطیف اور موقع محل کے عین مطابق ہے۔ ان کے ظریفانہ جملوں میں پوشیدہ میٹھا اور گہرا طنز بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے طنزیہ فقرے بسا اوقات دو تین الفاظ پر ہی مشتمل ہوتے ہیں لیکن وہ کسی ایسے موقعے پر برجستگی اور سادگی سے ادا کیے جاتے ہیں کہ موقع و محل اور مقام کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ بات کہہ بھی دیتے ہیں اور بات بگڑتی بھی نہیں۔

خاکہ نگاری کی مخصوص اسلوب کے باعث دیگر اصناف سے ممتاز ہے۔ محمد طفیل کے اسلوب میں طنز کی آمیزش، اظہار مافی الضمیر کے تقاضوں، بیان احوال کی مجبوری کے باعث محسوس ہوتی ہے۔ ان کے یہاں طنز کا استعمال فن کے اظہار سے زیادہ دل کے درد کا ترجمان محسوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ان کے جملوں میں پوشیدہ طنز قاری کے چہرے پر مسکراہٹ کا سامان پیدا کرتا ہے تو ایک دبی دبی کسک بھی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

محمد طفیل طنز کو شعوری طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ طنزیہ پیرائے میں کوئی پیغام دیتے ہیں۔ وہ واقعے کے کسی خاص موڑ پر ایسا جملہ کہتے ہیں کہ جو مخصوص طنزیہ انداز کی بنا پر ان کی مراد واضح کر دیتا ہے لیکن ان کے لہجے میں کسی کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی الٹا یہ جملہ ایک قسم کے نشتر کا کام کر دیتا ہے، ایسا نشتر جو فرد یا معاشرے کی رگوں سے فاسد خون نکالنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

محمد طفیل نے بعض سماجی رویوں پر ہلکا پھلکا طنز کر کے قاری کو ان سے بچنے کا پیغام بھی دیتے ہیں لیکن انھوں نے خود کو بطور واعظ پیش نہیں کیا۔ سماجی ناانصافیوں، معاشرتی رویوں، دوستوں کی بے اعتنائیوں اور زندگی کی ناہمواریوں کا اظہار وہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ قاری مایوس ہونے کی بجائے انھیں زندگی کا لازمی حصہ جان کر بے اختیار مسکرانے لگتا ہے۔ سیاست پر محمد طفیل کا طنزیہ اسلوب ملاحظہ فرمائیے:

"اس دنیا میں ہمارے لیے قدم قدم پہ غم کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ کوئی آدمی بھی تو مطمئن نہیں۔ بڑوں کو قوم کا غم کھا رہا ہے اور چھوٹوں کو اپنا غم۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑے قوم ہی کو کھا رہے ہیں لیکن میں یہ بات سنی ان سنی کر دیتا ہوں۔" (۳)

سیاست گو کہ محمد طفیل کا موضوع نہیں لیکن سماجی عمل کی بنا پر ایک ادیب سیاست سے قطعی طور پر لاتعلق بھی نہیں رہ سکتا۔ اب اسے بد قسمتی ہی شمار کرنا چاہیے کہ مادر وطن کی سیاست ایک ادیب کے لیے کوئی خوشگوار تجربہ نہیں رہی۔ ادیبوں اور شاعروں کو سیاست اور اہل سیاست سے شکوہ ہی رہا۔ محمد طفیل اپنے خاکوں میں ایک ایسا فرضی خط بھی درج کرتے ہیں۔ منٹو کی طرف سے لکھے گئے اس خط میں وہ جہاں منٹو کا طرز سامنے لاتے ہیں وہیں ایک مقام پر سیاست پر گہرا طنز بھی کرتے ہیں۔ ان جملوں میں آج کی سیاست کا عکس بھی ملتا ہے۔ ان کے یہ الفاظ آج کی صورت حال پر بھی کہے جاسکتے ہیں۔ جبکہ انھیں لکھے ہوئے نصف صدی بیت چکی ہے۔

"تمھارے ہاں کے ادیب اور تمھارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں سیاست تو کوئی بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جانو، میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔" (۴)

مزاحیہ تحریر صرف حماقت کے بیان کا نام نہیں بلکہ مزاح زندگی کی ایک حقیقت کا نام ہے اور مزاحیہ تحریر اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے۔ مزاح کا کمال یہ ہے کہ انسان اپنی غلطیوں کو بغیر کسی جھنجلاہٹ کے قبول کرتا ہے بلکہ ان پر قہقہہ بھی لگا سکے۔ محمد طفیل گو خود نہ اہل سیاست میں شمار کیے جاتے تھے اور نہ ہی وہ معروف معنوں میں مذہبی شخصیت تھے لیکن ایک ادیب کی حیثیت سے سیاسی رویوں کے علاوہ محمد طفیل نے دین و مذہب کے حوالے سے بعض معاشرتی رویوں پر بھی بڑے لطیف انداز سے چوٹ کی ہے۔ وہ موقعے کی نزاکت کے حوالے سے لفظ کے انتخاب کی خاص رعایت رکھتے ہیں اور عام اور سادہ انداز میں گہری بات لکھنے کے فن کے ماہر ہیں۔ لکھتے ہیں: "چنانچہ تینوں نمازی کڑکتی دھوپ میں اللہ کا نام لے کر نکل پڑے۔ شوکت صاحب کو نماز سے زیادہ ایک اور ضروری کام تھا اس لیے وہ معذور تھے۔" (۵)

متذکرہ بالا جملے میں لفظ معذور سے پر لطف معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ کیوں کہ "نماز سے معذور ہونا" ایک شرعی اصطلاح بھی ہے اور معذور کا لفظ عام بول چال میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نماز سے زیادہ ایک ضروری کام کے بعد معذور کے استعمال نے جملے میں دونوں معنی پیدا کر دیے۔ سمجھنے والا قاری دونوں معانی کا ادراک کر کے نماز کے حوالے سے معاشرے کے عمومی رویے پر کیے جانے والے طنز کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

محمد طفیل نے سماج میں پائے جانے والے کئی رویوں پر گہری چوٹ بھی کی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان کا طنز خنجر کی کاٹ کی بجائے زخم پر مرہم رکھنے کی خاصیت رکھتا ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں سے نفرت کی بجائے انھیں قبول کرنے کا گر سکھاتے ہیں اور فن اور اہل فن کو تعصب سے دور رہنے کا پیغام دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "میں یہاں اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ اچھے شعر کہنے کے لیے اچھا انسان بنیے۔ ویسے اچھا انسان بننا کوئی بری بات بھی نہیں ہے۔ میں نے کئی اچھے آدمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ اچھا شعر نہیں کہہ پاتے۔ بر خلاف اس کے واجبی قسم کے برے انسانوں کو اچھا شعر کہتے سنا ہے۔ میں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں، ورنہ میرے ہی کئی دوست مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔"(٦)

مذکورہ پیراگراف کی آخری سطر میں معاشرے کی عمومی رویے کی طرح شاعروں اور ادیبوں میں پائی جانے والی عدم برداشت اور تنگ نظری کی جانب محمد طفیل نے لطیف انداز میں چوٹ کی ہے لیکن کسی مبالغے کی بجائے اظہار واقعیت کا اسلوب اختیار کر کے ایک طنزیہ رمز میں اپنا شکوہ ظاہر کر دیا ہے۔

محمد طفیل ادب اور اہل ادب کے قدر دان تھے۔ ان کی تمام زندگی ادب کی خدمت میں بسر ہوئی۔ وہ ادیبوں اور شاعروں کے مزاج سے آشنا تھے۔ انھوں نے اہل فن کو بشری کمزوریوں سمیت قبول کرنے اور انسانی احترام کا درس دیا ہے۔ اہل ادب کی قدر دانی کے باوجود بسا اوقات انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کے بعض رویوں پر گہری لیکن میٹھی اور کسی کسی مقام پر تیکھی تنقید بھی کی ہے اور کھل کر طنز بھی کیا ہے۔ تحریر ملاحظہ ہو:

> "نئے لکھنے والوں نے یہ ضروری سمجھ لیا ہے کہ صاحب کردار ہونا اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا، ادب کی موت کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً سارے لکھنے والے اپنے آپ کو عام لوگوں سے کچھ الگ سا بنا لیتے ہیں۔ میں نے انھیں بے قاعدگی

میں یکتا، بے ضابطگی میں فرد، ذمہ داریوں سے بے نیاز اور اپنے آپ سے بے خبر پایا ہے۔ کاش آج کا ادیب اتنا صاحب کردار نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔" (۷)

محمد طفیل کے طنز میں گہرائی ہے لیکن وہ کاٹ نہیں ہے جو کسی تعصب کی بنا پر اہل قلم کے فقروں میں دکھائی دیتی ہے۔ تعصب کی جگہ محمد طفیل کے جملوں میں اظہارِ واقعیت کا عنصر نمایاں ہے جس سے الفاظ کی معنویت میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور جملے میں حقیقی رنگ جھلکنے لگتا ہے اور قاری محمد طفیل کے پیغام کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ واقعیت کو پر لطف انداز میں پیش کرنا ایک ادیب کے فن کا کمال ہے۔ محمد طفیل نیاز فتح پوری کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"ان کا شعروں پر عملِ جراحی کچھ مکتبی تعلیم ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ استادوں کے سوالات شاید اب تک ان کے ذہن سے نہیں نکلے۔ جیسے شعروں کی نثر کرو، ترکیب نحوی کرو، تقطیع کرو، دعوے کے ساتھ ثبوت پیش کرو وغیرہ وغیرہ"۔ (۸)

مزید لکھتے ہیں:

"نیاز صاحب نے فارسی تو اپنے والد ماجد سے پڑھی اور عربی عرب میں محمد طیب اور مولوی صدیق حسن غازی پوری سے، انہی بزرگوں کا یہ سب کیا دھرا ہے جو آج نیاز کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ اب تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ فارسی اپنے والد صاحب سے بھی زیادہ جانتے ہوں اور عربی اپنے استادوں سے بھی زیادہ، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ان کے فقرے سمجھ میں نہیں آتے۔" (۹)

محمد طفیل اظہار واقعیت کے ذریعے جو طنز کرتے ہیں اس کا مقصد محض چوٹ کرنا نہیں بلکہ رویے یا طرز عمل کی اصلاح ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان کے طنز کی کاٹ محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے انسانی عیوب کو فطری انسانی کمزوری قرار دے کر ان سے نفرت کی جگہ قبول کرنے کا پیغام دیا ہے۔ یہ پیغام ان کے طنز میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے جب وہ انسانی کمزوریوں اور رویوں پر چوٹ کرتے ہیں تو بری معلوم ہونے کی بجائے زندگی کا حصہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ذرا دیکھیے کہ وہ عیوب کو حوصلہ مندی سے کس خوبصورت انداز میں تحریر کر دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"نواب محمد علی خان ان کے چچا تھے۔ آمدنی کوئی لاکھ روپے سالانہ کی ہو گی۔ اتنی ہی کچھ آمدنی ان کے والد بزگوار (نواب بشیر احمد خان) کی تھی جو ان صاحبِ حوصلہ بزرگوں نے بدانتظامی، مقدمہ بازی اور دل کے ارمان نکالنے کی نذر کر دی۔ تلچھٹ میں جو کچھ انھیں ملا انھوں نے بھی خاندانی روایات کو شرمسار نہ ہونے دیا۔ خوب خوب عیش کیے، خوب خوب جیئے۔" (۱۰)

"صاحب حوصلہ بزرگوں" کی ترکیب میں پوشیدہ میٹھا طنز کس طرح پورے منظر کو ہی تبدیل کر رہا ہے۔ کچھ ایسے ہی مناظر ہمارے سماجی حالات میں آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرے میں پائے جانے والے ظاہری تکلف پر محمد طفیل کے پر لطف طنز کا ایک نمونہ یہ بھی ہے:

"میں کئی ایسی شخصیتوں سے واقف ہوں جنھوں نے اپنے اوپر شرافت کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو جھانکنا مشکل ہے، چہ جائیکہ پڑھ لینا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر سے اگر ایک غلاف اتار دیا جائے تو وہ بالکل آدمی کی صورت میں نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ بعض کے دو غلاف اتارے جائیں تو، بعض کے تین اتریں تو۔۔۔ اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں جتنے چاہیں غلاف اتار ڈالیں، ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔" (۱۱)

محمد طفیل نے نوجوانوں کے خوش فہم مزاج پر بھی شستہ لیکن بھرپور طنز کیا ہے۔ واقعیت کی بنا پر اس میٹھے طنز میں ایک مسرت آمیز کیفیت اور شوخی پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں: "نوجوان ہر اس نگاہ کو، جو ان پر اچانک پڑ گئی ہو، اپنے معاشقوں کی ابتدا سمجھ لیتے ہیں۔" (۱۲)

محمد طفیل کے اسلوب خاکہ نگاری میں معصوم فقروں میں چھپے گہرے شوخ رنگ دراصل ان پر خلوص جذبوں کا ظریفانہ اظہار ہے جو ایک سچا ادیب، معاشرے کے لیے اپنے قلب میں موجزن رکھتا ہے۔ ایسا رنگ بسا اوقات دل کے درد کے ساتھ ایک میٹھے، لطیف اور نکتہ آفرین طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اظہار کا منفرد پہلو، اسے نیا رخ عطا کرتا ہے جو تیکھا ہونے کے باوجود جاذبِ نظر بھی ہوتا ہے اور قابلِ قدر بھی۔

محمد طفیل کے خاکوں میں پر تجسس انداز کی بدولت جہاں شخصیت کے اوصاف نمایاں ہوئے ہیں وہاں ہلکے پھلکے انداز میں کیے گئے طنز کی بنا پر انسانی نفسیات، مزاج اور رویوں کی عکاسی بھی بخوبی ہوتی ہے۔

محمد طفیل خاکوں میں حکایاتِ مضحک کے ذریعے مضمون میں دلچسپی پیدا کرنے کا ہنر بھی آزمایا گیا ہے لیکن ان کا مزاح بھی زندگی کے متنوع پہلوؤں پر رائے زنی کرتا ہے اور قاری کے چہرے پر ایک شائستہ مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ ان کا مزاح بسا اوقات ایک داخلی تبسم کو بیدار کرتا ہے جس کا اظہار قاری کی آنکھیں مسکرا کر کرتی ہیں کیوں کہ وہ زندگی کے ایک نئے پہلو سے آگاہ ہوتا ہے۔ معلومات کے خزانے میں کسی ادیب یا شاعر کے داخلی حالات و اطوار کے ساتھ ساتھ اس دور کی ادبی تاریخ سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ان کا طنز مزاح کی مٹھاس سے بھرپور ہوتا ہے اور مزاح بسا اوقات ایک پر لطف طنز میں بدل جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"ہر شخص اپنے آپ کو عقلِ کل کا مالک اور شائستگی کا منبع سمجھتا ہے۔ الحمدللہ کہ بندہ بھی اپنے آپ کو ایک ایسا ہی شخص سمجھتا ہے۔ قتیل صاحب کے بارے میں بھی میرا ایسا ہی خیال ہو سکتا تھا بشرطیکہ یہ پٹھان نہ ہوتے۔

اصل میں ان میں جتنی خرابیاں یا اچھائیاں ہیں، وہ ان کے پٹھان ہونے کی وجہ سے ہیں۔ میں نے لغت میں پٹھان کے معنی دیکھے وہاں یہ لکھا تھا سپاہی، خونخوار اور لڑاکا۔ اس سے زیادہ میں قتیل صاحب کی کیا تعریف کروں؟" (۱۳)

طنز اگر معاشرے کی رگوں سے فاسد خون نکالنے کا کام کرتا ہے تو مزاح سے معاشرے کو آکسیجن ملتا ہے۔ محمد طفیل ایک ماہر سرجن کی طرح دونوں کام کر گزرتے ہیں۔ محمد طفیل کے طنز میں شائستگی کا عنصر ان کی انفرادیت ہے۔ مزاح کی چاشنی بھی تحریر کا حسن دوبالا کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اچھا انسان اپنی غلطیوں پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ایک اچھا مزاح نگار خود پر چوٹ کر کے دوسروں کو مسکرانے کا موقع دیتا ہے۔ محمد طفیل لکھتے ہیں:

"یہ تو طے ہے کہ آج کے بچے، پہلے بچوں سے زیادہ ذہین ہیں مگر ایسے بقراط بچے، ایسے سقراط بچے، جو معصومیت کے باوجود ایسے نکتہ شناس ہوں کہ کوئی نکتہ باقی نہ چھوڑیں کم ہوں گے۔

میں تو اب ان کے گھر جاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں مبادا پوچھ لیں
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا" (۱۴)

ضرب الامثال اور محاوروں کو زبان کا تہذیبی سرمایہ کہا گیا ہے کیوں کہ محاورے اور ضرب الامثال کسی زبان کے تہذیبی رویے، مزاج اور طرز فکر اور معاشرتی عادات کی عکاسی کرتے ہیں۔ محمد طفیل نے محاوروں اور

ضرب الامثال کے تہذیبی اثرات کو گہرائی کے ساتھ سمجھ کر ان کا شعوری طور پر استعمال کیا ہے اور بات سے بات پیدا کر کے معاشرے کے رویوں پر پُر لطف انداز میں طنز بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ جو مضمون میں یہاں پڑھ رہا ہوں، یہ کوئی اصل تھوڑا ہی ہے۔ اصلی مضمون تو یار دوستوں میں بیٹھ کر زبانی ہی سنا سکتا ہوں، یہاں اگر میں نے ایسی بے تکلفی برتی تو آپ مجھ سے بھی ناراض ہو جائیں گے اور زیدی صاحب سے بھی۔ لہذا میں آپ کی خوشنودی طبع کے لیے نقلی مضمون پڑھوں گا۔

میں نہ تو آبیل مجھے مار کا قائل ہوں اور نہ ہی جا بیل اسے مار کا قائل۔ اس پر بھی اگر جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں تو میرا کیا قصور۔"(۱۵)

ایک اچھا مزاح نگار اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ محمد طفیل کے خاکوں میں اپنی ذات پر طنز اور خود اپنی ہی مزاحیہ عادات کے اظہارِ بیان میں شگفتگی اور بذلہ سنجی کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے: "۱۹۵۰ء میں مجھے بھی سرخاب کا پر لگ گیا۔ یعنی نقوش کی ادارت میرے حصے میں آئی۔"(۱۶)

اسی نوعیت کی ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمایئے جس میں پر لطف مکالمے کا مکمل تاثر موجود ہے جو ایک طرف ایک بڑی شخصیت کے طرزِ گفتگو سے منعکس ہونے والی طبعی ظرافتوں کی چمک کو اجاگر کرتا ہے تو ساتھ ہی اس میں خود صاحبِ تحریر پر گہرا طنز بھی پایا جاتا ہے۔ مولانا نیازی سے ان کی گفتگو ملاحظہ ہو:

"فارسی جانتے ہو؟"

"جی نہیں!"

"'عربی؟"

"جی نہیں"

"علم منطق اور معقولات و منقولات؟"

"جی نہیں"

"پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ امی ہوں۔"(۱۷)

طنز و مزاح پر مشتمل تحریر انسان کو ہنسنے یا مسکرانے پر مجبور کرتی ہے اور ساتھ ساتھ معاشرے کے متعلق دلچسپ حقائق، معلومات اور نت نئے تصورات سے بھی قاری کو آگاہ کرتی ہے جو بسا اوقات نہایت سبق آموز ہوتے ہیں۔ یعنی مزاح محض ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں نہ ہی یہ پھکڑ بازی یا مسخرہ پن ہے۔

محمد طفیل اس بات سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتے کہ ادیبوں اور شاعروں کو صاحب کردار بھی ہونا چاہیے لیکن انھوں نے خاکہ نگاری کی صنف میں جہاں شخصیت کی صفات و عادات کو جانچا اور پرکھا ہے وہاں گاہے گاہے، ادیبوں اور شاعروں کے رویوں پر لطیف طنز بھی ملتا ہے۔ ان کے جملوں میں پوشیدہ طنز سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ معاشرے کی روح کی ترجمانی کرنے والوں اور رجحان سازوں کا کام کرنے والوں کو خود بھی اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ محمد طفیل خود اپنے ہی خاکے میں رقمطراز ہیں:

> "انھیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس غلط فہمی نے انھیں مدیرِ نقوش بنا دیا تھا۔ ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت! ہنھ!
>
> یہ غلط فہمی انھیں یوں بھی ہوئی کہ تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے ان کے ذاتی اور اچھے مراسم تھے۔ ان میں سے کوئی دوست تھا تو کوئی بھائی، ان کے مدیر ہونے کے فوراً بعد، بھائی دوست بن گئے اور دوست دشمن، الحمد للہ کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا کوئی دوست ہی نہیں۔ سب اپنے اپنے دلوں میں بھرے بیٹھے ہیں۔" (۱۸)

محمد طفیل واقعات کے اظہار میں بھی شگفتہ رنگ اپناتے ہیں۔ ابراہیم جلیس کے خاکے میں لکھتے ہیں کہ وہ حیدر آباد دکن کی یادگار ہیں اور انھوں نے بہادری یہ دکھائی کی ریڈیو اسٹیشن پر رضاکاروں کا ساتھ دیا اور اسی بہادری کا صلہ انھیں یہ ملا کہ پاکستان آنا پڑا۔

اچھا مزاح نگار زندگی کے ہر رنگ کا مشاہدہ کرتا ہے اور زندگی سے پیار کرنے کا سبق سکھاتا ہے۔ اسی طرح ایک عمدہ مزاح میں انسانی کمزوریوں کو قبول کرنے اور انسانوں کا احترام کرنے کا سبق بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ محمد طفیل نے عادات و مزاج اور انداز گفتگو کو بھی مضحک اور دلچسپ انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے اسی طرح جہاں شخصیت کا دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے وہاں بات میں ایک مزاحیہ لیکن شائستہ رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

"ویسے یہ بیچارے بھی میری ہی طرح بے ضرر اور غیر مفید انسان ہیں۔ ان کی دشمنی سے نہ کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، نہ ان کی دوستی سے کوئی فائدہ۔ دشمنی میں زیادہ سے زیادہ تیر ماریں گے تو کسی کے خلاف ریویو لکھ دیں گے، دوستی پر اتریں گے تو اسے ایک کپ چائے پلا دیں گے۔

میز کے گرد بیٹھے، ہاپڑ کو روتے رہیں گے۔

ہائے کیا لوگ تھے وہ بھی اور کیا زمانہ تھا وہ، اب فجو کی ریوڑیاں نہیں ملتیں، مُجو کے پاپڑ نہیں ملتے، کُجو کی گجک نہیں ملتی، بجو کے دہی بڑے نہیں ملتے۔"(۱۹)

ہر اچھے ادیب کی طرح محمد طفیل بھی طنز و مزاح کے ذریعے قارئین کو مسرت پہنچانا اور انھیں زندگی کی خوبصورتیوں اور لطافتوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق کو ہنس کر بخوشی قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کا مزاح سے نمکین فقرہ مقصدیت سے خالی نہیں ہوتا، اسی طرح طنز سے بھی معاشرے میں پائی جانے والی کسی خرابی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ معاشرے کے عمومی رویے کے علاوہ محمد طفیل نے مخصوص طبقے یعنی ادیبوں اور شاعروں کی عادات اور ان کی مزاجی کیفیات پر بھی نقد کیا ہے۔

ایک اچھے مزاح نگار کی طرح محمد طفیل کا قلم بھی زندگی کے حقائق کو رقم کرتا ہے اور ان کی تحریر کے آئینے میں ایک عام قاری معاشرے کے عمومی رویوں کا ایک دوسرے زاویے سے مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے دلچسپ، مضحک، تبسم آمیز اور دل کے شگوفے کھلانے والے پہلوؤں سے آگاہ ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح طنز و مزاح پر مشتمل تحریر میں مذاق نہیں ہوتا اس میں حقیقت ہی کو تلمیح کے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔ اور تصورات، حقائق اور واقعات پر شستہ، شائستہ اور میٹھے انداز میں تبصرہ کیا جاتا ہے، اسی طرح محمد طفیل نے سوانحی ادب کی دلچسپ صنف، خاکہ نگاری میں اپنے خاص ادبی ذوق کا رنگ جماتے ہوئے ہلکے پھلکے اور شوخ و تیکھے جملوں کی بدولت خاکہ نگاری کی جو تکنیک استعمال کی اس میں جابجا طنز اور مزاح کے عناصر بھی پیدا ہوتے چلے گئے۔ بے شک یہ ایک شعوری کوشش تھی۔ محمد طفیل کے پیش نظر طنز و مزاح کے ذریعے اس ماحول کو اجاگر کرنا بھی تھا، جس میں وہ کسی شخصیت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس کوشش کا حاصل یہ نکلا کہ خاکہ نگاری سمیت دیگر اصناف ادب میں طنز و مزاح کا مقصد ہنسنا ہنسانا ہی نہیں ہے بلکہ ان عناصر کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا بلاکم و کاست ابلاغ اور اپنے پیغام کی وضاحت بھی مطلوب ہوتی ہے جس کے بغیر کوئی بھی تحریر بے قیمت شمار ہو سکتی ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور م اشاعت اول، مئی ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۲

۲۔ محمد طفیل، آپ، ادارہ فروغ اردو، لاہور، بار سوم، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۹

۳۔ محمد طفیل، صاحب، ادارہ فروغ اردو، لاہور، بار اول، سن نامعلوم ص ۸۶

۴۔ ایضاً، ص ۴۳، ۴۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۷۔ محمد طفیل، آپ، ادارہ فروغ اردو، لاہور، بار سوم، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵

۸۔ ایضاً، ص ۴۰

۹۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۱۳۔ محمد طفیل، مجبی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، بار اول، جنوری، ۱۹۸۱، ص ۱۳۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۱۵۔ محمد طفیل، مکرم، ادارہ فروغ اردو، بار سوم، ۱۹۶۸، ص ۲۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۸۔ محمد طفیل، جناب، ادارہ فروغ اردو، لاہور، بار دوم، ستمبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۱۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۹۸

محمد ابرار ارشد
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ
ڈاکٹر محمد افضال بٹ
صدرِ شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

# ظفر علی خان کے اخبارات ورسائل: تحقیقی مطالعہ

## Zafar Ali Khan's Newspapers and Magazines

Maulana Zafar Ali Khan is one of the most respected names in Urdu literature and Urdu journalism. He exposed Urdu journalism to new heights.Zafar Ali Khan's literary career began in Hyderabad during the Deccan era. His first journal "Afsana" was the publication of a fictionalized translation of Western fiction. Zafar Ali Khan released another magazine "Deccan review" for his scholarly writings Zafar Ali Khan takes over as editor of his newspaper "Zamindar" after the death of his father Maulvi Sirajuddin Ahmed. The "Zmeendar" who was just the voice of the landlords has now become the voice of the whole Indian and Urdu class. Maulana Zafar Ali Khan released another magazine, "Punjab Review" which could not continue for long. Zafar Ali Khan released a scholarly and literary magazine when the English government of India banned the "Zameendar".

**Keywords:** *Newspapers, magazine, literature, Fiction, journalism, short story, politics, poetry, novel, criticism, auditorial, publishing*.

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برصغیر میں مسلم قیادت کا شدید بحران پیدا ہوا کیونکہ اکثر و بیشتر رہنما و علما کو پھانسی دے دی گئی یا پھر جبری جلاوطنی اور ہجرت پر مجبور کر دیا گیا؛ ایسے میں سرسید خان جیسے مصلحِ قوم کا مسلمانوں کی باگ ڈور سنبھالنا نہایت فائدہ مند ثابت ہوا۔ بدلے حالات میں مسلمان سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور ادبی حوالے سے نہایت بدحالی کا شکار تھے۔ انگریز مسلمانوں کو اپنا ازلی دشمن سمجھ رہا تھا اور انگریز طبقے میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا ہے، وہ اقتدار چاہے کیسا کمزور اور شکستہ ہی کیوں نہ تھا، مسلمان اپنے اقتدار کو واپس حاصل کرنے کے لیے لازمی جدوجہد کریں گے۔ انگریز یہ بھی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں جب تک جذبہ جہاد باقی ہے وہ اپنی نشاۃ الثانیہ اور احیائے ملت کے لیے لازمی کوشاں رہیں گے؛ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو محروم طبقہ بنانے اور سیاسی و معاشرتی سطح پر دبانے کی بھرپور کوشش کیں۔ اس بات کی تائید ۱۸۵۷ء کے دوران میں

لاہور کے ایک اینگلو انڈین انگریزی اخبار ''لاہور کرانیکل'' کے اداریے اور تبصرے کرتے ہیں۔ ۱۱نومبر ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں یہ اخبار لکھتا ہے:

"مسلمان کی فطرت میں باغیانہ جذبہ موجود ہے۔ یہ اُس کے مذہب نے پیدا کر رکھا ہے۔ جب تک ہماری حکومت مسلمانوں کا مذہب برداشت کرے گی اس وقت تک دشمنی کا جذبہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ روز بروز بڑھے گا۔"(۱)

اسی اخبار میں ایک نامہ نگار لکھتا ہے:

"اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس بغاوت کی تہ میں مسلمانوں کی سازش کار فرما ہے۔ انھیں شدید سے شدید سزا دینی چاہیے کیونکہ یہ جب تک مسلمان ہیں اپنی رائے کو نہ بدل سکتے ہیں نہ بدلیں گے۔"(۲)

انگریزوں نے کینہ پروری اور انتقامی کارروائیوں سے مسلمانوں کو کمزور کرنے اور معاشی طور پر مفلوک الحال کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ مسلمان بھی انگریز کی نفرت میں جدید علوم و فنون سے بے زار ہوتے چلے گئے۔ ان حالات میں مسلمانوں میں سر سید احمد خان جیسا ہمدردِ قوم پیدا ہوا جس کو مسلمان قوم کی ابتری، بدحالی، محرومی اور پریشانی کا صحیح ادراک تھا۔ سر سید کا خیال تھا کہ مسلمان جب تک جدید علوم سے آراستہ نہیں ہوں گے اور علوم و فنون کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ، منطق وغیرہ میں دَرک حاصل نہیں کریں گے تب تک وہ اپنی حالت کو درست نہیں کر سکیں گے۔ سر سید واحد فرد تھے جن کو انگریزوں کا اعتماد بھی حاصل تھا اور وہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دوریاں ختم کرنے اور ان کو قریب لانے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ ''رسالہ بغاوتِ ہند'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس میں سر سید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا مدلل اور منطقی تجزیہ کیا۔ سر سید نے مسلمان قوم کا مقدمہ ایک منجھے ہوئے وکیل کی طرح لڑا اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اصلاح اور بہتری کے لیے بہت سے عملی اقدامات بھی کیے۔ سر سید نے جو ہمہ وقت خدمتِ قوم کی وہ شاید اور کوئی فرد نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے ہر محاذ پر چاہے وہ سیاسی ہو، مذہبی ہو یا ادبی قوم کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں اور قوم کے لوگوں نے کے لیے نئے راستے متعین کیے جن پر گامزن ہو کر وہ عظمتِ رفتہ کا سراغ پا سکتے تھے۔ سر سید نے جو ادارے قائم کیے ان سے قوم کو پسماندگی دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام ہے؛ ان کے اس ادارے کی

علمی و ادبی فضا میں تربیت پا کر بہت سے ایسے درخشندہ ستارے آسمانِ ہند پر طلوع ہوئے جن کی تابناکی اور روشنی سے اس قوم کے نصیب کی تاریکی دور ہوئی۔

ظفر علی خان بھی علی گڑھ کے تربیت یافتہ تھے ان کی علمی و ادبی تربیت اُسی خاص ماحول میں ہوئی تھی۔ انھوں نے شبلی نعمانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے تھے؛ پروفیسر آرنلڈ سے فیض حاصل کیا تھا؛ حالیؔ اور محسن الملک کی آنکھیں دیکھی تھیں؛ سرسید کی قوم کے لیے تڑپ محسوس کی تھی؛ محمد علی، شوکت علی، میر محفوظ علی بدایونی، مولوی عبدالحق، عزیز مرزا جیسوں کی رفاقت میں دن گزارے تھے۔ وہ جدید علوم و فنون کی افادیت سے آگاہ تھے اور قوم کی ان سے دوری سے بھی واقف تھے۔ ظفر علی انگریزی زبان کی اہمیت کو بھی جانتے تھے اور خود بھی انگریزی میں مہارت رکھتے تھے؛ علی گڑھ کی علمی و ادبی سوسائٹیوں کا حصہ تھے؛ شاعری کرتے تھے اور علی گڑھ میں ہونے والے مختلف علوم کے مذاکروں میں شرکت کرتے تھے۔ الغرض اس پرزور اور توانا شخصیت کے ابتدائی خدوخال علی گڑھ ہی میں ترتیب پائے جس نے بعد میں انگریزی استعمار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس زمانے میں جب مسلمان ابھی اس شعوری سطح پر نہیں پہنچے تھے کہ اپنی کامل آزادی اور انفرادی حیثیت کے حصول کے لیے انگریز سے برسرپیکار ہوں؛ وہ ابھی متحدہ ہندوستان میں انگریز ہی کے زیرِ سایہ اپنے مقامی حقوق اور عالمی سطح پر مسلمان ملت کے حقوق کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے؛ ایسے میں ظفر علی خان نے مسلمان کو باشعور اور باصلاحیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنی صحافتی تحریروں سے جو گراں قدر خدمات پیش کیں ان کا جائزہ آئندہ صفحات میں لیا جائے گا۔

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ظفر علی خان کو نواب محسن الملک کی رفاقت نصیب ہوئی جس سے ان کی سیاسی، صحافتی اور ادبی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہوا۔

"نواب محسن الملک ان دنوں حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ خواجہ غلام الثقلین کے مستعفی ہونے کے بعد نواب صاحب کو ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کی وساطت سے ظفر علی خان کا تقرر اس جگہ ہوا، اور وہ نواب صاحب کی انگریزی خط کتابت کا جواب دینے کے علاوہ ان کے ایماوارشاد پر فلسفے کے مضامین اور کتب وغیرہ کا اردو ترجمہ کرتے تھے۔"(۳)

ظفر علی خان نے تقریباً ایک سال کا عرصہ نواب کی صحبت میں گزارا، بعد ازاں حیدر آباد کے علمی و ادبی ماحول کا چرچا سن کر وہاں قسمت آزمائی کی ٹھانی۔ وہ ایک نئے ماحول اور فضا کے متلاشی تھے اور حیدر آباد دکن کا ماحول

زوال دِلی و لکھنو کے بعد ہندوستان بھر میں سے واحد و یکتا ماحول تھا جہاں صاحبانِ علم و فن کی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ پورے ہندوستان کے ماہرینِ علم و فن، ادیب وغیرہ حیدر آباد دکن میں رونق افروز تھے، سو ظفر علی خان بھی یہاں چلے آئے اور نواب محسن الملک کی سفارش اور شبلی نعمانی کے مشورے سے حیدر آباد فوج میں ملازم ہو گئے۔ فوج میں بھی جوہرِ قابل دکھائے۔ نیزہ بازی، شہ سواری، پیراکی میں ماہر تھے اور ورزش کے حد درجہ شوقین نیز کھیل کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ابھی زیادہ دن یہاں نہ گزرے تھے کہ علی گڑھ کے سینئر ساتھی مولوی عزیز مرزا کے ایما پر ہوم آفس چلے آئے۔ مولوی عزیز مرزا ان دنوں حیدر آباد دکن میں ہوم سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ ظفر علی خان نے پوری مہارت اور تن دہی سے کام لیا اور جلد ہی مترجم سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے پر ترقی پا گئے۔ حیدر آباد دکن میں ظفر علی خان کی تمام تر علمی و ادبی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور وہ مختلف علمی و ادبی مشاغل میں حصہ لیتے رہے۔ تصنیف و تالیف اور تراجم کا ایک وقیع سلسلہ شروع ہوا۔ بطورِ صحافی ان کی شخصیت کے ابتدائی خد و خال بھی حیدر آباد دکن ہی میں ترتیب پائے اور یہاں ہی انھوں نے مختلف رسائل و جرائد کے اجرا کا سلسلہ قائم کیا۔ ظفر علی خان کی صحافتی نثر کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ ان رسائل و جرائد پر ایک نگاہ ڈالی جائے جو مختلف ادوار میں ظفر علی خان نے جاری کیے؛ ان رسائل و جرائد کا عہد، ان کے اجرا کے اسباب اور ان کے رجحانات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے، تاکہ ان کے تناظر میں مولانا ظفر علی خان کی صحافتی نثر کی درست تفہیم کی جا سکے۔

**افسانہ:**

"افسانہ" مولانا ظفر علی خان کا جاری کردہ پہلا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ ماہوار تھا۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے بقول یہ رسالہ ۱۹۰۲ء کے اواخر میں جاری ہوا[۴] جبکہ پہلا شمارہ جولائی میں اشاعت پذیر ہوا۔ ظفر علی خان نے اس رسالے کا اجرا "Mysteries of London" کے ترجمے جو وہ ان دنوں کر رہے تھے کی اشاعت کے لیے کیا۔ یہ ترجمہ "فسانہ لندن" کے عنوان سے رسالہ "افسانہ" میں شائع ہوا۔ مولانا کے بعض وقائع نگاروں نے اس کا عنوان "اسرارِ لندن" لکھا ہے جو کہ درست نہ ہے، مثلاً غلام حسین ذوالفقار "ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر" میں لکھتے ہیں:

"ظفر علی خان نے حیدر آباد دکن میں سنہ ۱۹۰۲ء کے اواخر میں "افسانہ" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس میں مسٹریز آف لندن کا ترجمہ "اسرارِ لندن" کے عنوان سے شائع کیا۔"(۵)

اس رسالے کی ابتدائی قیمت ۲ سکہ انگریزی اور ۸ سکہ حالی متعین کی گئی اس رسالے کے اجرا کے مقصد کے متعلق ظفر علی خان شمارہ اول کے صفحہ اول پر رقم طراز ہیں:

"1۔ یہ رسالہ حیدر آباد دکن سے ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا اور اس کا حجم پچاس صفحے ہو گا۔ 2۔ اس میں صرف ایسے ناولوں کا ترجمہ یکے بعد دیگرے درج ہوا کرے گا جو دلچسپ اور پر لطف ہونے کے ساتھ مذہب اور نتیجہ خیز ہوں گے۔ ترجمہ میں اس بات کا التزامِ خاص کیا گیا ہے کہ اصل کے مطابق اور ساتھ ہی فصیح وبامحاورہ ہو۔"(۶)

مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ اس رسالے میں مختلف ناولوں کے تراجم شائع کرتے رہیں گے لیکن ان کی بے چین طبع صرف ایک ترجمے ہی پر اکتفانہ کر سکتی تھی اور نہ ہی ان کی فکر اتنی محدود تھی لہٰذا بہت جلد کہ ابھی "فسانہ لندن" بھی مکمل نہ چھپا تھا کہ مولانا نے ایک نیا رسالہ "دکن ریویو" (جنوری ۱۹۰۴ء) کے نام سے جاری کر دیا۔ "فسانہ لندن" کی کچھ اقساط "دکن ریویو" کے ساتھ بھی شائع ہوئیں۔

**دکن ریویو:**

"دکن ریویو" (جنوری ۱۹۰۴ء) ایک ماہانہ رسالہ تھا جس میں علمی و ادبی تحریریں شائع ہوتی تھیں، نیز ادبیات اردو کا جدید تنقیدی اصولوں کے مطابق جائزہ بھی لیا جاتا تھا بہت جلد یہ رسالہ برصغیر کے علمی حلقوں میں اپنی وقعت پیدا کر گیا۔ ہندوستان میں "دکن ریویو" کے معاصر ادبی رسائل مثلاً شیخ عبدالقادر کا "مخزن"، عبدالقادر کا، عبدالحلیم شرر کا "دلگداز" وغیرہ جاری تھے۔ "دکن ریویو" ان رسائل سے کسی طور پیچھے نہ رہا۔ "دکن ریویو" میں لکھنے والے چند ادبا کے نام درج ذیل ہیں: شبلی نعمانی، اکبر الٰہ آبادی، مولوی عبدالحق، رضا علی وحشت، سید علی حیدر طباطبائی، سر کشن پرشاد، مرزا محمد ہادی عزیز، سید فضل حق، سید کاظم حسین شیفتہ، نواب نصیر حسین خیال وغیرہ۔

"دکن ریویو" چھوٹے سائز کے باون (۵۲) صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور سرورق قدرے موٹے کاغذ کا ہوتا تھا۔ رسالہ کی طباعت اور کتابت معیاری تھی اور ایڈیٹر کی محنت اور خوش ذوقی کی آئینہ دار تھی۔ ہر مورچے میں آرٹ پیپر ایک عکسی تصویر بھی شائع کی جاتی تھی۔(۷) شخصی تصاویر نامور لوگوں کی ہوتی تھیں اور اس کا شخصیت کا ایک تعارف نامہ بھی رسالے کے صفحات کی زینت ہوتا تھا۔"

"دکن ریویو" اردو زبان و ادب کی خدمت میں نمایاں خدمت سرانجام دے رہا تھا لیکن اس کی اشاعت میں ترتیب اور توازن نہ آسکا (جس کی بہت سی وجوہات ہیں جن کا آئندہ صفحات میں ذکر آئے گا) کبھی آٹھ دس ماہ کا وقفہ آجاتا اور کبھی تین تین چار چار شمارے اکٹھے بھی آجاتے۔ بعض خاص نمبر بھی شائع کیے گئے۔ جن میں "اسلام نمبر" خاص معروف ہوا۔ اس نمبر کے بارے میں غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

> "۱۹۰۷ء میں انھوں نے "دکن ریویو" کے دو ضخیم "اسلام نمبر" نکالے۔ ان میں عالمِ اسلامی کے سیاسی و معاشرتی کوائف پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے طویل مضمون "العالم الاسلامی" میں اسلامی ملک کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کی تھیں اور ظفر علی خان نے "اتحاد بین المسلمین" پر سیر حاصل بحث کر کے اس تصور کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا تھا۔"(۸)

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ "دکن ریویو" اور "افسانہ" اکٹھے ہی شائع کیے جاتے رہے اور ان رسائل کی ضخامت ۵٦ صفحات پر مشتمل تھی اس میں "دکن ریویو" کے لیے ۳۲ صفحے مختص تھے۔ عام طور پر "دکن ریویو" کو الگ انفرادی حیثیت ہی سے مولانا کے وقائع نویسوں نے متعارف کرایا ہے لیکن فی الحقیقت مولانا نے "افسانہ" کے ساتھ ہی یہ پرچہ شامل کیا تھا۔ اس ضمن میں مولانا "دکن ریویو" کا پہلا سال ختم ہونے کے بعد اگلے سال کے پہلے اداریے میں لکھتے ہیں:

> "اس وقت تک پورے پرچہ کی قیمت تین روپے سکہ انگریزی اور صرف "دکن ریویو" کی قیمت دو روپے پانچ آنے ڈاک کے محصول کے علاوہ تھی۔ کل پرچہ کا حجم ۵٦ صفحے تھا جس میں "دکن ریویو" کے ۳۲ صفحے رکھے گئے تھے۔"(۹)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں رسائل اکٹھے ہی شائع ہوتے تھے، البتہ قارئین کی سہولت کے لیے ان کی الگ الگ خرید کی بھی اجازت تھی۔ جس شمارے کا اوپر کا اقتباس درج کیا گیا ہے اسی کے

ایڈیٹوریل میں مولانا نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ آئندہ سال جنوری ۱۹۰۵ء سے "افسانہ" بند کر دیا جائے گا اور صرف "دکن ریویو" والا حصہ ہی اشاعت پذیر ہوا کرے گا۔ مولانا کی تحریر سے ہی دونوں رسائل کے اکٹھے شائع ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "سالِ آئندہ یعنی جنوری ۱۹۰۵ء سے پرچہ کے نام سے افسانہ کا لفظ حذف کر دیا جائے گا اور صرف "دکن ریویو" رہنے دیا جائے گا جو بجائے خود ایک جامع نام ہے۔"(۱۰)

جب "دکن ریویو" کے ساتھ "افسانہ" کا شائع ہونا موقوف ہوا تو مولانا کو بہت سے قارئین نے خط لکھے جس میں "افسانہ" کے دوبارہ اجرا کی درخواست کی گئی۔ اپنے ایک ایڈیٹوریل میں مولانا ظفر علی خان اپنے ایک دیرینہ ساتھی میر حیدر علی خاں کے خط کا اقتباس بھی شائع کیا جس میں "افسانہ" کے از سرِ نو اجرا کی درخواست کی گئی۔ میر حیدر علی خان کا کہنا تھا کہ "دکن ریویو" کی ساری دلچسپی صرف "افسانہ" کے سبب سے تھی ورنہ "دکن ریویو" کے مضامین اور مقالات اتنے دلچسپ اور وقیع نہیں ہیں کہ اپنے معاصر رسائل "مخزن" اور "زمانہ" وغیرہ کا مقابلہ کر سکیں۔(۱۱)

بہر حال "فسانہ لندن" کی دلچسپی اور مقبولیت اپنی جگہ لیکن "دکن ریویو" معیار اور انتخاب میں کسی بھی دوسرے معاصر رسالہ سے کمتر نہیں تھا، بلکہ علمی و ادبی حلقوں کی جانب سے مولانا کے طرزِ صحافت اور انتخابِ موضوعات کو سراہا جاتا رہا، بعض صاحبِ علم لوگوں نے تعریف و توصیف کے جو خطوط مولانا ظفر علی خان کو لکھے ان کے اقتباسات انھوں نے بعض ایڈیٹوریلز میں شائع بھی کیے۔

حیدر آباد دکن کے حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی؛ مولوی عزیز مرزا جو دکن میں ہوم سیکرٹری تھے وہ ڈپٹی کمشنر گلبرگہ متعین ہو گئے اور میر محفوظ علی بدایونی مجسٹریٹ ہو کر سومالی لینڈ چلے گئے؛ احباب کے یوں بکھر جانے سے ظفر علی خان کا جی بھی ملازمت سے اچاٹ ہونے لگا۔ مولوی عزیز مرزا کی جگہ نواب سر بلند جنگ محکمہ عدالت و امورِ عامہ اور کوتوالی کی معتمدی پر مامور ہوئے۔ نواب صاحب سخت مزاج شخص تھے اور ظفر علی خان کا مزاج یکسر مختلف تھا، اس سے پیشتر کے اختلافات رونما ہوتے ظفر علی خان خود ہی حیدر آباد دکن سے کنارہ کش ہو گئے۔ مولانا کے دکن سے چلے جانے کے متعلق مختلف آرا ہیں جو زیادہ معتبر اور موزوں ہے وہ کچھ یوں ہے:

> "نواب صاحب کچھ تنک مزاج اور ترش رو تھے۔ ظفر علی خان سے ان کی کیسے نبھ سکتی تھی؟ ان کی جودتِ طبع کو ایک نیا مضمون ہاتھ آ گیا۔ مرزا رفیع سودا تو تھے نہیں کہ

"غنچہ" کو قلمدان لانے کے لیے کہتے۔ قلم اٹھایا اور ہجو کہہ ماری۔ پیشتر اس کے کہ یہ ہجو عام ہوتی اور نواب سر بلند جنگ کو خبر ہوتی ظفر علی خان نے ایک سال کی رخصت لی اور اپنے عزیز دوست میر محفوظ علی بدایونی کے پاس بربرہ (سومالی لینڈ چلے گئے)۔"(۱۲)

میر محفوظ علی بدایونی صاحب سے مولانا کی ملاقات تقریباً سال بھر کے وقفے سے ہوئی تھی؛ ادھر وہ بھی نوکری سے زیادہ خوش نہیں تھے اور زندگی گزارنے کا کوئی اور ڈھب سوچ رہے تھے اور یوں دونوں دوستوں نے کاروبار میں قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔

مولانا ظفر علی خان حیدر آباد دکن سے سومالی لینڈ ہوتے ہوئے بمبئی چلے آئے اور اپنے دیرینہ ساتھی میر محفوظ علی بدایونی کے ساتھ مل کر کاروبار کرنے کی ٹھانی۔ اس ضمن میں غلام حسین ذوالفقار رقم طراز ہیں:

"دونوں دوستوں نے مل کر بمبئی میں امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھولنے کی ٹھانی۔ چنانچہ بمبئی میں ایک مکان کرائے پر لیا گیا اور اورئینٹل کمرشل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ بناڈالا گیا۔ جاپان سے ریشم اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان درآمد کیا گیا، مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ دونوں دوست ادیب تھے اور یہ مسئلہ کاروبار کا تھا جس کے لیے تخیل سے زیادہ حقیقت پسندی کی ضرورت تھی۔ تھوڑے دنوں میں کاروبار ٹھپ ہو گیا۔"(۱۳)

میر محفوظ علی بدایونی شکستہ دل اور مایوس ہو کر اپنے گھر بدایوں چلے گئے اور ظفر علی خان بمبئی میں ہی مقیم رہے اور زندگی گزارنے کا کوئی نیا ڈھب تلاش کرنے لگے۔ فرصت کے انہی ایام میں انھوں نے بمبئی سے "دکن ریویو" جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی دو تین شمارے ہی نکلے تھے کہ مولانا بھی "دکن ریویو" کی جنم بھومی حیدر آباد دکن واپس آ گئے۔ یہاں واپس آ کر علمی و ادبی سرگرمیوں کا درخشاں دور از سرِ نو شروع ہوا لیکن یہ دور بھی زیادہ طویل ثابت نہ ہو سکا اور مولانا کو "دکن ریویو" بند کرنا پڑا۔ آپ رسالے کی ادارت اور ملکیت سے دستبردار ہو گئے اور رسالہ مولوی مودود احمد قادری کو دے دیا گیا۔ وقت کی کمی اور سرکاری مصروفیات کے ساتھ ساتھ کمزوری صحت کا بہانہ مولانا نے بطورِ وجوہ بیان کیا در حقیقت مولانا کو اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ دکن میں ان کے خلاف سازشیں عروج پر ہیں۔ دکن کی محلاتی سیاست میں جو اتار چڑھاؤ آتے تھے ظفر علی خان بھی اس کا شکار ہوئے۔ مولانا کے مخالفین نے ان پر جو اعتراضات عائد کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مولانا سرکاری ملازم ہوتے ہوئے کیسے ایک

رسالے کا اجرا کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف ایک تھیٹر میں رقص و سرور میں شریک فنکاروں کا شکریہ ادا کرنے کی ذمہ داری مولانا کو تفویض کی گئی چونکہ مولانا اس قسم کے ثقافتی پروگراموں کو شعائرِ اسلامی کے خلاف سمجھتے تھے، لہٰذا انھوں نے بڑی جرأت اور بے باکی سے بجائے تعریف و توصیف کے اس ثقافتی شو کی مذمت شدید الفاظ میں کر ڈالی۔ مخالفین کو موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے انگریز ریزیڈنٹ سر مائیکل ایڈوائر کے کان میں مولانا کی یہ جراتِ رندانہ ڈال دی اور ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کیا کہ مولانا شدت پسندوں اور جمال الدین افغانی کی تحریک سے متاثر ہیں۔ لہٰذا مولانا زیرِ عتاب آئے اور دکن بدر کر دیے گئے۔

ایک تاثر یہ بھی تھا کہ مولانا میر عثمان خان ولی عہد ریاست دکن کو نظام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے چونکہ ظفر علی خان میر عثمان علی خان کے قریب تھے اور امورِ سیاست میں ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ شاید اسی لیے مولانا ظفر علی خان کے بعض وقائع نویسوں نے ان کو ولی عہد کا اتالیق بھی لکھا ہے۔ بہر حال مولانا کسی بھی بغاوت میں شریک نہ تھے بلکہ وہ ریاست حیدر آباد دکن کے خیر خواہ اور اس سے محبت کرنے والے تھے البتہ ان کا یہ خیال ضرور تھا کہ حیدر آباد دکن ایک خود مختار سلطنت کا روپ دھارے اور نظام کو ہز میجسٹی کا خطاب دیا جائے۔ سر مائیکل ایڈوائر کو مولانا اور ان کے رفقا کے ان نظریات کی بھنک پڑ گئی اور اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مولانا اور ان کے بعض احباب کو جن میں مولوی عزیز مرزا بھی تھے، دکن سے نکلوا دیا۔ چنانچہ مولانا ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو اپنے آبائی وطن کرم آباد پنجاب آ گئے جہاں ان کے والد ماجد مولوی سراج الدین احمد علیل تھے لہٰذا آتے ہی مولانا ان کی تیمار داری میں مصروف ہو گئے۔

**زمیندار:**

ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد علم و ادب سے خاص شغف رکھتے تھے۔ شاعری سے بھی دلچسپی تھی لیکن اپنے والد مولوی کرم الٰہی کے ٹوکنے اور منع کرنے پر شعر گوئی ترک کر دی۔ عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے اور دونوں زبانوں کی تعلیم اپنے والد مولوی کرم الٰہی سے گھر ہی پر حاصل کی۔ مولوی کرم الٰہی کے ایک بنگالی شاگرد سے پڑھ کر انگریزی میں بھی استعداد بہم پہنچائی۔ فارغ التحصیل ہو کر محکمہ ڈاک میں ملازمت کر لی اور مختلف مقامات پر تعینات رہے۔ بعد ازاں کشمیر چلے گئے اور محکمہ ڈاک و تار سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر اپنے آبائی گاؤں کرم آباد آ گئے بعد ازاں لاہور سے ہفت روزہ زمیندار کا اجرا کیا۔ پھر اس رسالہ کو کرم آباد لے آئے۔ ''زمیندار'' کے اجراء کا مقصد کاشت کاروں اور زمینداروں کی معاشرتی و معاشی

اصلاح تھا۔ انھوں نے میاں محمد شفیع کے ساتھ مل کر ایک زمیندار ایسوسی ایشن کی بنیاد بھی رکھی جس کا مقصد زمینداروں کے حقوق کا تحفظ کرنا اور ان کے فلاح و بہبود کے کام کرنا تھا۔ مولوی سراج الدین احمد نے سماج کے اس پسے ہوئے اور محنتی طبقے میں شعور اجاگر کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں۔ ظفر علی خان نے "زمیندار" اور اپنے والد کے متعلق لکھا ہے:

> "سب سے پہلے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لحاظ سے آپ نے ایک اخبار بنام "زمیندار" جاری کیا اور اس کے ذریعہ سے اپنی آواز جو گم کردۂ راہ کارواں کے لیے بہ منزلہ بانگِ درا تھی، زمینداروں تک پہنچانی شروع کی۔ یہ آواز اول اول بہت ہی دھیمی اور مدھم تھی لیکن رفتہ رفتہ بلند اور پاٹ دار ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ دشت و جبل اور وادی کہسار اس سے گونج اٹھے اور ایک اخبار "زمیندار" نے چند سال کے عرصے میں وہ کام کیا جو بڑی سے بڑی طاقتوں نے صدیوں سے انجام نہ دیا تھا۔ زمیندارانِ پنجاب میں حرکت اور بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔"(۱۴)

"زمیندار" اخبار کی کاوشوں سے زمیندار طبقے میں شعور اور بیداری کا جذبہ بیدار ہوا اور ان کے حقوق جو عرصے سے پامال کیے جا رہے تھے ان کے حصول پر یہ طبقہ آمادہ ہوا۔ مولوی سراج الدین احمد اپنے اخبار "زمیندار" کو ترقی کی منازل طے کرتے دیکھنا چاہتے تھے لیکن قضا و قدر نے انھیں مہلت نہ دی؛ انھوں نے اسے اپنے بیٹے ظفر علی خان کے سپرد کیا اور نصیحت کی کہ اس کی دیکھ بھال، اشاعت اور بہتری کے لیے کوئی سستی نہ کی جائے۔ مولوی سراج الدین احمد کی مردم شناس نگاہوں نے ظفر علی خان کی شخصیت میں موجود خوبیوں اور مہارتوں کو پہچان لیا تھا، بلکہ "دکن ریویو" کشمیر میں ان کی ملازمت کے دوران میں ان کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا اور وہ """دکن ریویو" کی تحریروں اور طرزِ صحافت کے معترف تھے جس کا اظہار انھوں نے ظفر علی خان کے نام ایک پیغام میں بھی کہا تھا۔

"خدا خوش اردو علم و ادب میں روح پھونک رہے ہو۔ عید الفطر کے روز میرے ہاں بہت خوش مذاق و تعلیم یافتہ اصحاب کا مجمع تھا جس میں علاوہ نذیر احمد صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کشمیر کے کئی دیگر علی گڑھ گریجوایٹ بھی تشریف رکھتے تھے۔ "دکن ریویو" کے مضامینِ نظم و نثر سے بڑھ کر دوسری غذائے روح کیا ہو سکتی تھی وہ وہ

ریڈنگ ہوئے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ سب لوگ عش عش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ سخن را بر سرِ کرسی نشاندی۔ خدا "دکن ریویو" کی عمر دراز کرے اور آپ کو تادیر اس کے سر پر سلامت رکھے۔"(۱۵)

مولوی سراج الدین احمد کو ظفر علی خان سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ ان پر پورے اترے اور "زمیندار" کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک لے گئے۔ اب "زمیندار" صرف زمینداروں اور کاشت کاروں کے مسائل کے احاطے تک محدود نہ رہا، بلکہ "کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے" مصداق پوری امتِ مسلمہ کے جذبات کی ترجمانی کرنے لگا۔ ملکی اور عالمی سطح پر وہ واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ظفر علی خان کی سمندِ فکر کے لیے تازیانے کا کام دیا۔

"جب مولانا ظفر علی خان نے اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کی وفات پر ہفت روزہ "زمیندار" کی ادارت سنبھالی تو یہ اخبار اپنی روایات کے مطابق ایک نہایت ہی معتدل روش پر گامزن تھا۔ اتنے میں پے در پے ایسے واقعات ہوئے جن سے برعظیم کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ، حادثہ کانپور، جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان نے جہاں "زمیندار" کو ایک پرجوش اور طوفانی صحافت کا نقیب بنا دیا وہاں لیلائے سیاست نے انھیں اس عشوہ و ادا سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ اسی کے ہو رہے۔"(۱۶)

کرم آباد کی محدود فضا اور ماحول میں "زمیندار" صحافت کی ان منازل کو طے نہیں کر سکتا تھا جو بعد میں اس کا مقدر ہوئیں اس بات کا ادراک ظفر علی خان کو بھی تھا اور ان کے بعض احباب مثلاً سر شہاب الدین وغیرہ نے بھی ان کو مشورہ دیا کہ آپ "زمیندار" کو لاہور سے شائع کریں۔ ظفر علی خان نے اس صائب مشورے پر عمل کیا اور "زمیندار" کا دفتر لاہور میں بادشاہی مسجد کے قریب ہیرا منڈی کے بازار میں ایک مکان منتقل کر دیا۔ لاہور آ کر "زمیندار" کی سابقہ روش یکسر تبدیل ہو گئی اور اس نے مقامی مسلمانوں کی حالتِ زار کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے بھی لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کیا۔ لاہور میں اس وقت اردو کے دو اخبار صحافت کے منظر نامے پر بہت واضح تھے۔ ایک "وطن" اور دوسرا "پیسہ اخبار" ان اخبارات کی پالیسی مصلحت پسندی اور سب اچھا ہے دکھانا تھی۔ لیکن ظفر علی خان نے لوگوں کو حقیقت کا آئینہ دکھایا۔ عوام کے مسائل کو صحیح معنوں میں اجاگر کیا یہی وجہ ہے کہ جلد ہی مذکورہ بالا اخبارات کی سرکولیشن محدود ہوتی گئی اور "زمیندار" عوام خواص میں یکساں مقبول ہوتا گیا، یہاں ایک جملہ معترضہ یہ بھی ہے کہ پیسہ اخبار اور "وطن" کے مالکان اور ایڈیٹر ان نے ظفر علی خان اور "زمیندار" کی بڑھتی مقبولیت سے خائف ہو کر کاروباری چشمک کی ابتدا کر دی؛ ظفر علی خان کی کردار کشی کی گئی ان

کی پالیسیوں پر تنقید کی گئی۔ الغرض گھمسان کا رن پڑا لیکن "زمیندار" تمام تر رکاوٹوں کے باوجود لوگوں کا پسندیدہ اخبار بن گیا۔ ظفر علی خان کے معاصر ابوالکلام آزاد اپنے اخبار "الہلال" میں لکھتے ہیں:

> "روزنامہ زمیندار کی اشاعت سے پہلے اخبار بینی طبقہ میں محدود تھی اور عام بیداری و احساس کے پیدا ہونے میں ایک ایسا مانع عظیم تھا جس کی وجہ سے کوئی تحریک اور کوئی آواز عام قوت و اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ جنگِ طرابلس نے قوم کے تمام طبقات کو خبروں کا شائق بنایا اور زمیندار کی عام مقبولیت شروع ہو گئی۔ اس کی اشاعت بیس بیس ہزار روزانہ تک پہنچی اور اس کی ارزانی اور عام فہم ہونے نے اسے عام دکانداروں اور بازار کے بیٹھنے والوں تک پہنچا دیا۔ ہر شخص جو اردو عبارت پڑھ سکتا ہے، علی الصباح اس طرح زمیندار کا خواہش مند ہوتا تھا، گویا یورپ اور امریکہ کا ایک تعلیم یافتہ عادتاً صبح کے وقت مطالعۂ اخبار کے لیے بے قرار ہے۔"(۱۷)

"زمیندار" نے عالمِ اسلامی کے متعلق خبریں دے کر لوگوں کے جذبات کی درست انداز میں ترجمانی کی، لوگوں کے اندر شعور پیدا ہوا؛ جوش و جذبہ سے قوم کا ہر فرد سرشار ہو گیا۔ خواص اور پڑھے لکھے لوگ تو رہے ایک طرف ان پڑھ آدمی بھی اخبار خریدتا؛ دو آنے میں اخبار خریدا جاتا اور ایک آنے میں پڑھوائی کروا کے سنا جاتا۔ ایک دور تو ایسا آیا کہ "زمیندار" کی صبح و شام اشاعت کا اہتمام بھی کیا گیا۔ ظفر علی خان نے جہاں "زمیندار" کے مزاج اور رجحان کو یکسر بدل دیا وہاں انھوں نے اردو صحافت کو بھی بہت متاثر کیا۔ اردو صحافت کے انداز، اسلوب، رجحانات میں جو اختراعات اور جدتیں آئیں وہ ظفر علی خان ہی کے طرزِ صحافت کے سبب تھیں۔ یورپی طاقتیں جس طرح ترکی کا استحصال کرنا چاہتی تھیں اور جب ۱۹۱۰ء میں اٹلی نے دیگر یورپی طاقتوں کی آشیر باد سے اپنی فوجیں طرابلس کے ساحلوں پر اتاریں؛ اس سے ہندوستان کے اور دنیا بھر کے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ پیدا ہوا اور وہ سمجھنے لگے کہ یورپ ان کے حقوق کو بری طرح پامال کرنے پر آمادہ ہو چکا ہے۔ یہی واقعہ پہلی جنگِ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ انہی حالات میں ظفر علی خان کا "زمیندار" عوام کے جذبات کی ترجمانی میں مصروف تھا، اور لوگوں کے اندر ایک جوش و ولولہ پیدا کر رہا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں۔ چنانچہ ظفر علی خان نے ضرورت محسوس کی کہ اخبار ہفت روزہ کی جگہ روزنامہ کر دیا جائے اور یوں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے روزنامہ "زمیندار" کا

ایڈیشن شائع ہوا۔ ''زمیندار'' کے مسلم عوام کی معاشرتی اصلاح اور مختلف اقوام کے درمیان اتحاد و یگانگت اور رواداری پر بھی زور دیا ہے اس لیے یہ ہندوستان کی تمام عوام میں یکساں طور پر مقبول ہوا۔

''زمیندار'' نے اردو صحافت کو ایک نئی عظمت سے روشناس کرایا، سطحیت سے وجاہت میں بدلا اور اردو میں پرچہ نویسی کے بجائے اخبار نویسی کا اعلیٰ ذوق پیدا کیا۔ ظفر علی خان نے اپنی صحافتی تحریروں سے اخبار کی شعر و ادب کی چاشنی کو اضافہ دیا۔ ظفر علی خان کی تحریروں کی ادبیت سے متاثر ہو کر ایک وسیع طبقہ اردو اخبارات کی اہمیت کا معترف ہوا۔ ''زمیندار'' کا حسن صرف ظفر علی خان کی تحریریں ہی نہیں تھیں بلکہ مولانا نے اپنے ذوق سے کام لے کر اخبار نویسی کے انداز و اطوار میں بھی قابلِ قدر اور دل کش تبدیلیاں کی تھیں۔ انھوں نے ادارتی صفحے کی ترتیب بدل کر اس میں ایک تنوع پیدا کیا۔ ''زمیندار'' میں ہی ادبی نوک جھونک کی صورت گری کی، ادارتی صفحے میں مقالہ افتتاحیہ کے ساتھ طنزیہ اور مزاحیہ کالم کا اجرا کیا جو بعد ازاں مولانا عبدالمجید سالک لکھتے رہے، اخباری شاعری کی بنیاد رکھی جو رفتہ رفتہ ہجو نویسی اور طنز نویسی کا طرز اختیار کر گئی۔ ظفر علی خان نے اخبار کے ظاہری حسن اور اس کی پیش کش میں بھی نمایاں تبدیلیاں کیں جو بعد میں رجحان ساز ثابت ہوئیں، کالمی سرخیوں اور عنوانی سرخیوں کا رواج بھی اردو صحافت کو انہی کی دین ہے، اردو صحافت کو نئے نئے الفاظ اور جدید تراکیب سے نوازا جس سے اردو صحافت کی لغت میں اضافہ ہوا۔ ''زمیندار'' سے پہلے اردو کا کوئی بھی اخبار نیوز ایجنسیوں سے بلاواسطہ خبروں کو حاصل نہیں کرتا تھا۔ یہ سہرا بھی ''زمیندار'' کے سر ہے کہ اس نے رائیٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا سے براہِ راست خبریں حاصل کیں۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے جنگِ بلقان اور طرابلس کے زمانے میں ''زمیندار'' کی اشاعت تیس ہزار تک پہنچ گئی۔[١٨] اس زمانے میں یہ کسی بھی اردو اخبار کی بہت بڑی سرکولیشن اور کامیابی تھی۔

ظفر علی خان نے زمیندار میں جہاں تازہ بہ تازہ خبروں سے لوگوں کو آگاہ کیا وہاں یورپ کے جنگی جنون اور امتِ مسلمہ کے دگرگوں حالات کے تنقیدی تجزیوں نے جو ''زمیندار'' کے صفحات کی زینت بنتے تھے۔ اخبار کی وقعت اور پسندیدگی میں اضافہ کیا۔ عوام میں اس اخبار کو جہاں قبولِ عام حاصل ہوا وہاں انگریز سامراج کی طرف سے قدغن بھی لگا دیے گئے۔ زمیندار کی ابتلا و مصیبت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ''زمیندار'' سے اولاً ایک ہزار روپیہ بطور صحافت طلب کیا گیا؛ اس کی ضبطی کے بعد مزید ضمانتیں طلب کی گئیں جن کی تعداد کافی زیادہ ہے، رقم بھی بڑھا کر پانچ سے دس اور پھر پندرہ ہزار کر دی گئی، یہ سب ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ سر مائیکل ایڈوائیر جب

پنجاب کا لیفٹننٹ گورنر متعین ہوا تو ظفر علی خان اور زمیندار کے لیے مزید مشکل دور آیا۔ ضمانتوں کے ساتھ ساتھ پریس بھی ضبط کیا گیا۔

جب انگریز سامراج کی سختیاں بڑھتی گئیں تو "زمیندار" کا مزاج بھی بدلتا گیا۔ ظلم و ستم، پے در پے ضبطیاں، جرمانے، قید و بند سے ظفر علی خان کے پائے استقامت میں لرزش نہ پیدا کی جا سکی اور وہ اور زیادہ تندی اور سختی کے ساتھ برطانوی استعمار سے برسرپیکار ہوئے۔ ظفر علی خان کے متعلق تاجور نجیب آبادی لکھتے ہیں:

> "یہ قہرمانِ میدان ادب و صحافت اپنی ہنگامہ آفرین شخصیت کے اعتبار سے آج اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کی فلک فرسا ہمت، اولوالعزمی اور مصائب آرائی نے اسے تاریخ صحافت کا غیر فانی ہیرو بنا دیا ہے۔ قانون کی پیچ در پیچ بندشوں سے اس کی فطرت ابا کرتی ہے اور خطرات و عواقب پر ہنستا ہوا وہ ان نظر بندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ زمانہ ناسازگار کو بھی اس سے ضد سی آپڑی ہے کہ اس نے اپنی چیرہ دستیوں کے لیے چن لیا ہے۔ جیل، جرمانے، ضمانتیں، خانہ تلاشیاں، قرقیاں، ضبطیاں، غرض قانون کی کوئی گرفت ایسی نہیں جو اسے مجبور کرنے کے کام نہ آئی ہو لیکن قانون کو بھی اس جیسے دل گردہ رکھنے والے انسان سے بہت کم واسطہ پڑا ہو گا کہ قانون کی پیدا کی ہوئی ہر بربادی کے بعد ظفر علی خان کی خاک سے ایک چاک چوبند نعرے مارتا ہوا زندہ ظفر علی خان نمودار ہو جاتا ہے۔"(١٩)

مولانا کے مزاج اور رویے کا اثر ان کے اداریوں کے ساتھ اخبار کی مجموعی پالیسی پر بھی ہوا؛ اس بات کا اندازہ "زمیندار" کے سرورق ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جب "زمیندار" مولوی سراج الدین کی ادارت میں نکلتا تھا تو اس کی پیشانی پر قرآن حکیم کی ایک آیت کا ترجمہ لکھا ہوتا تھا کہ: "خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی حالت آپ نہ بدلے" اس کے ساتھ ایک شعر بھی مرقوم ہوتا تھا:

نام کو تو ہوں زمیندار اور اگر سوچو ذرا
قوم کا حاجت روا ہوں نوع کا مشکل کشا

جب ''زمیندار'' مولانا ظفر علی خان کی ادارت میں آیا تو انھوں نے اس شعر کو میر عثمان علی خان کے درج ذیل شعر سے بدل دیا:

تم خیر خواہِ دولتِ برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

جب ''زمیندار'' پر پے در پے امتحانات آئے اور انگریز نے طرح طرح کی سختیاں کی ''زمیندار'' کی مجلسِ ادارت کو بارہا گرفتار کیا گیا۔ ضمانتیں ضبط کی گئیں، مطبع بھی ضبط کیا گیا؛ خود مولانا کو گرفتار کیا گیا تو ''زمیندار'' کی پیشانی سے یہ شعر ہٹادیا گیا اور مولانا کا اپنا ایک شعر لکھا جانے لگا۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

''زمیندار'' کی پیشانی پر جو قرآن کی آیت کا ترجمہ لکھا ہوتا تھا وہ بھی شعر کی صورت میں بدل گیا اور مولانا کا شعر جو بعد میں زبان زدِ عام ہو گیا، کو لکھا دیا گیا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اشعار کا یہ ردّ و بدل ''زمیندار'' اور ظفر علی خان کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ بدلتے حالات اور رونما ہوتے واقعات دونوں کے مزاج اور رجحانات پر اثر انداز ہوتے رہے۔ مولانا کی صحافتی تحریروں کا تفصیلی جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

**پنجاب ریویو:**

حیدرآباد دکن کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ظفر علی خان جب اپنے آبائی گاؤں کرم آباد آگئے اور اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کی وفات کے بعد ان کے رسالے ہفت روزہ ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی لیکن ''زمیندار'' کا محدود کینوس ان کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس وقت تک ''زمیندار'' ابھی کسانوں اور زمینداروں کی معاشی اور معاشرتی اصلاحات پر ہی لکھتا تھا جبکہ مولانا حیدر آباد دکن میں ''دکن ریویو'' جیسا علمی و ادبی پرچہ چھوڑ کر آئے تھے لہٰذا اپنے مزاج کے عین مطابق انھوں نے ''دکن ریویو'' کی طرز اور

پایہ کا میگزین ''پنجاب ریویو'' نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ بھی ''دکن ریویو'' کی طرح ماہنامہ تھا اور اس کی ضخامت پچاس صفحات تھی۔ ابتدا میں یہ رسالہ بھی کرم آباد سے شائع ہوتا رہا اور بعد ازاں ''زمیندار'' کے ساتھ مولانا اسے بھی لاہور سے آئے۔ ''دکن ریویو'' کی طرح اس رسالے میں بھی علمی و ادبی مضامین کی اشاعت کی جاتی۔

''پنجاب ریویو بھی مشرق و مغرب کے صحت مند ادبی افکار کا ترجمان تھا جس میں انگریزی مضامین کے بامحاورہ اردو تراجم بھی شامل ہوتے تھے۔ ترجمہ کرنے کی صورت بقول حامد علی خان صاحب یہ ہوتی تھی کہ مولانا کے ہاتھ میں انگریزی میگزین یا رسالہ ہوتا تھا۔ حقے کا کش لگاتے تھے اور انگریزی مضمون کو اس طرح اردو میں لکھواتے جاتے تھے جیسے ان کے سامنے انگریزی نہیں بلکہ اردو میں لکھا ہوا مضمون ہو۔''(۲۰)

پنجاب ریویو میں اس عہد کے بڑے بڑے نام اپنے مضامین اور شاعری اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، خود مولانا نے کئی شاندار اور بلند پایہ مضامین لکھے۔ مولانا کے کیے ہوئے تراجم بھی اس رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ رسالے میں جن ادبا کی تحریریں شائع ہوتی رہیں ان میں سے چند نام یہ ہے: مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولانا شبلی نعمانی، مولوی عزیز مرزا، مولوی عبدالحق، مولوی اسماعیل میرٹھی، علامہ محمد اقبال، اکبر الہ آبادی، علی حیدر طباطبائی، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، مرزا سلطان احمد خان، حسرت موہانی، شاہ دین ہمایوں وغیرہ۔ ظفر علی خان کے پنجاب ریویو میں چھپنے والے وہ مضامین جنھوں نے بہت شہرت حاصل کی ان میں اسلام کی برکتیں، جمال الدین افغانی یہ (مضمون پروفیسر براؤن کی کتاب ''انقلابِ ایران'' سے ماخوذ ہے اور مولانا نے اس میں بہت علمی اضافے بھی کیے ہیں۔ بعد ازاں یہ مضمون الگ سے ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہوا) شامل ہیں۔

ظفر علی خان اسلامی اتحاد اور ملت اسلامی کی ترقی و فلاح کے آرزو مند تھے اور وہ ساری زندگی اس کے لیے کوشاں رہے وہ آزادی ہند کے لیے عمر بھر برسرپیکار رہے اپنوں بیگانوں سبھی کے دشنام سہتے رہے۔ انگریزوں نے اسلام پسندوں کے لیے اس عہد میں پان اسلام ازم کی اصطلاح وضع کی تھی اور وہ مولانا کو ہندوستان میں پان اسلام ازم کا سب سے بڑا نقیب سمجھتے تھے۔ ''پنجاب ریویو'' میں مولانا نے اس اصطلاح پان اسلام ازم پر خوب علمی گفتگوئیں کی ہیں جو آئندہ صفحات میں زیرِ بحث آئیں گی۔

**ستارۂ صبح:**

انگریز حکومت نے جب مولانا ظفر علی خان اور ''زمیندار'' پر پے در پے سختیاں شروع کیں تو مولانا کے لب و لہجے اور قلم میں سختی اور جارنہ پن آتا گیا جس کے سبب اخبار ''زمیندار'' کی کئی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ بالآخرے

اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ظفر علی خان کرم آباد میں انڈین پریس ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیے گئے۔ مولانا کی نظر بندی کے دوران میں ضمانت کے طور پر بیس ہزار کے مچلکے اور بیس ہزار کی شخصی ضمانت بھی دی گئی۔ بیس ہزار کی ضمانت میں سے دس ہزار کی ضمانت سردار خزاں سنگھ نے دی، پانچ ہزار کی ضمانت اکبر شاہ نے اور پانچ ہزار کی ضمانت مولوی محمود احمد خان نے دی۔[۲۱] کرم آباد میں نظر بند ہونے کے بعد مولانا کی تحریریں زمیندار میں چھپنی بند ہو گئیں اور ان کو مدیر کی حیثیت سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ پہلے تو مولانا کا نام بطور مالک اخبار کے طور پر زمیندار کے سرورق پر لکھا جاتا رہا لیکن حکومتِ وقت کو یہ بھی گوارا نہ ہوا لہٰذا مولانا نے ۱۱ مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا نے اخبار کے حقوق کے ملکیت اپنی بیگم کے نام منتقل کر دیے اور اخبار پر مالک کے طور پر بیگم ظفر علی خان لکھا جانے لگا۔ لیکن اسی ظاہری تبدیلی کا اثر ''زمیندار'' کے مزاج اور رجحان پر کیا پڑتا اس نے اور شدت اور مخاصمت کا رویہ اختیار کر لیا۔ دوسری طرف حکومت کی طرف سے مزید سختیاں کی گئیں اور ''زمیندار'' جو پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان کے لوگوں کو عالمی حالات و واقعات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سیاسی شعور بھی بیدار کر رہا تھا پر مزید قدغن لگائے گئے۔ اب ''زمیندار'' دن میں ایک مرتبہ کے بجائے دو مرتبہ نکلنے لگا۔ اس سے حکومت کی بدمزاجی میں اضافہ ہوا، نتیجتاً ''زمیندار'' کو بند کر دیا گیا۔ ظفر علی خان نظر بندی میں جس طرح زندگی گزار رہے تھے وہ ایک ادیب اور شاعر کی نہیں بلکہ ایک کاشت کار کی سی تھی۔ مولانا نے خود کو کھیتی باڑی اور پھولوں، پھلوں کی کاشت کاری میں مصروف کر لیا؛ انھوں نے آموں کے پودے اور انگوروں کی قلمیں منگوا کر لگوائیں لیکن ایک قلم کار کتنی دیر خود کو لکھنے پڑھنے سے دور رکھ سکتا تھا، لہٰذا مولانا اپنی پرانی دلچسپیوں کی طرف لوٹنا چاہتے تھے جس کی اجازت انھیں حکومت سے نہیں مل رہی تھی:

''اُن دنوں ظفر علی خان کے مالی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ اخبار کی بندش سے حالت اور سقم ہو گئی تھی۔ نظر بندی کے ساتھ تحریر و تقریر کے سلسلے بند ہو گئے تھے۔ انھوں نے کاروبار کے بارے میں سوچا اور شکر سازی کا کارخانہ لگانے کا پروگرام بنایا مگر حکومت نے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر انھوں نے دائرہ معارف شرقیہ قائم کر کے اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھنے کا منصوبہ سوچا جس کی حکومت نے مشروط طور پر اجازت دی۔ یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی آخر کار کرم آباد سے ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ نکالنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ملی کہ اس پرچے میں سیاسی مسائل زیر بحث نہیں آئیں گے۔''[۲۲]

چنانچہ ۲۷ اگست ۱۹۱۷ء کو ایک ادبی پرچہ روزنامہ ''ستارۂ صبح'' جاری کیا گیا۔ اس دوران میں ایک اور واقعہ بھی پیش آیا کہ مولانا کی نظر بندی کے دوران میں ہی انھیں کسی باؤلے کتے نے کاٹ لیا اس زمانے میں کتے کے کاٹے کا علاج ہر جگہ نہیں ہوتا تھا اور اس سلسلے میں شملہ میں ایک علاج گاہ تھی؛ مولانا نے خط کتابت کے ذریعے حکومت کو اس واقعے سے آگاہ کیا اور شملہ جانے کی اجازت طلب کی جو فوراً دے دی گئی۔ مولانا نے بھی مصلحت اندیشی سے کام لیا اور اپنی سخت مزاجی اور حکومت مخالف جذبات میں کسی حد تک بدلاؤ لے آئے۔ شاید اس کی وجہ از سرِ نو اپنے اخبار پر سے بندشوں کے خاتمے کی خواہش تھی۔ بہر کیف ''زمیندار'' تو آزاد نہ ہو سکا لیکن مولانا کو ایک نیا روزنامہ ''ستارۂ صبح'' نکالنے کی مشروط اجازت مل گئی۔ ستارۂ صبح کے پہلے شمارے کی تصویر کشی عبد السلام خورشید نے کچھ یوں کی ہے:

''سرورق کے اوپر ''ربِ زدنی علما'' ماٹو کے طور پر درج ہے اس کے بعد یہ شعر دیا گیا ہے:

مل آں ستارۂ صبح کہ در محلِ طلوع
ہمیشہ پیش روِ آفتاب می باشم

پھر اخبار کے نام کی تختی ہے اس کے نیچے ایک طرف ''نشاۃ الثانیہ'' کے عنوان سے مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم درج ہے۔ جو اس اخبار کی معاشی اور معاشرتی پالیسی کا غماز ہے۔ اس کے بالمقابل اکبر الہ آبادی کا تازہ ترین کلام دیا گیا ہے۔ صفحہ ۴ پر ''جواہر ریزے'' کے عنوان سے مولانا کی سگ ریزی کے واقعہ، کسولی میں علاج، سرمائیکل ایڈوائز سے ملاقات اور روزنامہ صبح کے اجراء کی اجازت کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر دو صفحوں پر مشتمل ایک افتتاحیہ درج کیا گیا ہے۔۔۔۔ دو صفحات میں جنگی اور قومی خبریں ہیں۔ اس کے بعد ''اسرارِ خودی'' کے اشعار جلی قلم سے درج کر کے ان کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ حضرتِ علامہ اقبال کا ایک مقالہ بھی درج ہے جس کا عنوان ہے: ''رسول اللہؐ فنِ شعر کے مبصر کی حیثیت میں۔ شاعری کا موضوعِ صحیح۔''(۲۳)

ستارۂ صبح پر اگرچہ سیاسی موضوعات کو زیرِ بحث لانے پر پابندی تھی لیکن مولانا بعض باتیں اشاروں اور کنایوں میں بھی کر جاتے تھے۔ مولانا کی تحریروں کو سنسر کیا جانے لگا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ مولانا مضمون لکھتے، سنسر کی زد میں آجاتا۔ مولانا ترمیم و تنسیخ کر کے از سرِ نو لکھتے پھر سنسر کی زد میں آجاتا اور بعض دفعہ تو صورت ایسی بھی ہو جاتی تھی کہ مولانا نے پانچ دفعہ مضمون لکھا اور وہ پانچوں مرتبہ سنسر کیا گیا۔ مولانا نے اس اخبار کی مدد سے عوام کی

ذہنی تعلیم و تربیت کا بیڑہ اٹھایا؛ لوگوں کی اخلاقی اور معاشی حالت کو بدلنے کے لیے جو مولانا نے اپنے اخبار کے لیے استعمال کیا۔ مولانا کے ہنگامہ خیز اور ہنگامہ پرور مزاج کو کوئی میدان تو چاہیے تھا اور وہ میدان انھیں نام نہاد پیرانِ طریقت اور خود ساختہ صوفیوں کا رد کرنے کی صورت میں میسر آ گیا۔ مولانا نے بدعات کے استیصال کے لیے نہایت عمدہ مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کا مطمح نظر تھا کہ وہ برصغیر میں دینی اصلاح کا کام سرانجام دیں۔ مولانا ظفر علی خان نے قادیانی نبوت پر بھی ضرب کاری لگائی اور نبوت کے جھوٹے دعوے دار مرزا غلام احمد قادیانی کی ہرزہ سرائیوں اور مذہبی ریشہ دوانیوں کا جواب پوری طاقت، شدت اور دلائل و براہین کے ساتھ دیا۔

"دوسری اہم بحث جو "ستارۂ صبح" کا خصوصی موضوع بنی وہ طریقت اور شریعت کی دیرینہ آویزش کے حوالے سے متصوفین کے ایک گروہ کی متنازع فیہ روش تھی جو دراصل علامہ اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے بعد خواجہ حسن نظامی اور ان کے حلقے کے مقلدین کے ایک بڑے گروہ اور اقبال اور ان کے ہم خیال لوگوں کے مابین شروع ہوئی اور خاصی تلخ صورت اختیار کر گئی۔ ظفر علی خان اس معارضے میں اقبال کے ساتھ تھے۔"(۲۴)

یکم دسمبر ۱۹۱۷ء سے روزنامہ "ستارۂ صبح" کے ساتھ ہفت روزہ "ستارۂ صبح" کا آغاز بھی کیا گیا جو "زمیندار" کی طرز پر مہینے میں چار مرتبہ یکم، ۸، ۱۶، اور ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ دونوں اخبار ایک دو شماروں کے بعد کرم آباد کے بجائے لاہور سے شائع ہونے لگے۔ مولانا اخبار کو مرتب کرتے اور اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سے چھپ کر دفتر "ستارۂ صبح" ریاض بلڈنگ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ "ستارۂ صبح" میں مولانا نے ایک مستقل مضامین کا سلسلہ "جواہر ریزے" کے عنوان سے شروع کیا جس میں مختلف علوم و فنون کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی بحث کی جاتی۔ مولانا کی ادبی اور صحافتی زندگی میں "ستارۂ صبح" بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس اخبار میں مولانا نے جس قدر اداریے اور مضامین لکھے وہ اپنی "زمیندار" کی پوری صحافتی زندگی میں وہ نہ لکھ سکے۔ "زمیندار" کی ادارت کے دوران میں چونکہ مولانا کے مشاغل اور مصروفیت کثیر الجہتی ہوتی تھیں اور مولانا مستقل وقت لکھنے کو نہیں دے سکتے تھے؛ بعض دفعہ کوئی اداریہ شروع کرتے، تھوڑا بہت لکھتے اور کس اخباری جملے کے ساتھ کے حوالے کر دیتے کہ اسے مکمل کر دے۔ "ستارۂ صبح" چونکہ نظر بندی کے زمانے میں جاری کیا گیا اور مولانا کے پاس فرصت کے لمحات میسر تھے، اس لیے اس اخبار کے لیے مولانا نے جو کچھ بھی لکھا وہ پوری توجہ اور کامل یکجہتی کے ساتھ لکھا۔ اسی لیے مولانا نے رفقا اور احباب نے مولانا کی نظر بندی اور قید کو آزادی سے زیادہ فائدہ مند بھی کہا ہے۔ "ستارۂ

صبح'' میں مولانا ظفر علی خان نے صوفیوں کے وہ پول کھولے اور تصوف کی تاریخ پر وہ علمی مضامین لکھے جس کا اثر ایک وسیع طبقے پر ہوا۔ مضامین پر یہی موقوف نہ تھا بلکہ مولانا نے کئی نظمیں بھی اس موضوع پر کہیں۔

مولانا کی نظم و نثر کی تاب نہ لاتے ہوئے طریقت کے بھیس میں دنیادار صوفیوں نے وہ طوفان اٹھایا اور انگریز حاکمین کے حضور ظفر علی خان کی شعلہ نوائی و بے باکی اور جرأتِ رندانہ کی شکایتیں کیں۔ انگریز جو پہلے ظفر علی خان سے خار کھائے بیٹھا تھا اور ان کا دیرینہ کرم فرما سر مائیکل ایڈوائر تو کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ مولانا پر مزید سختیاں کی گئیں۔ ظفر علی خان خود لکھتے ہیں:

''نقلی صوفیوں اور جھوٹے پیروں کا پول ''ستارۂ صبح'' میں کچھ اس طرح کھولا گیا کہ دنیائے طریقت کے برخود غلط رہ نما چیخ اٹھے چنانچہ میرے خلاف ان بزرگوں نے ایک وسیع پیمانے پر سازش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ کس طرح میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں پہلے تو لاہور میں ایک دھوم دھامی جلسہ کیا جس میں مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا جواب تک واپس نہیں لیا گیا اس پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا:

کوئی ٹرکی لے گیا کوئی ایراں لے گیا
کوئی دامن لے گیا کوئی گریباں لے گیا
رہ گیا تھا نام باقی فقط اسلام کا
وہ بھی ہم سے چھین کر حامد رضا خاں لے گیا

اس کے بعد ایک میموریل تیار کیا گیا۔ جس پر طول و عرض ہند کے پیروں اور صوفیوں اور سجادہ نشینوں کے دستخط ثبت تھے۔ اس میموریل میں حکومتِ پنجاب سے استدعا کی گئی تھی کہ کس طرح میرا منہ بند کیا جائے یہ اسی میموریل کا نتیجہ تھا کہ مجھے پنجاب چھوڑنا پڑا اور کچھ عرصہ کے لیے حیدر آباد جا کر اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان کے دامن دولت میں پناہ لینی پڑی۔''(۲۵)

ایک طرف تو مولانا کے حریف یہ تھے، دوسری طرف قادیانی نبوت کے نام لیوا بھی پیچھے نہ رہے اور سر مائیکل ایڈوائر کے حضور جا کر مولانا کی شکایت کی جس کا ذکر انھوں نے ۲۵ جون ۱۹۲۰ء کے اداریے میں کیا ہے کہ ''ستارۂ صبح'' میں بشیر الدین محمود کی ''خلافت'' پر چند مدلل اور زبردست اعتراضات کیے جن کو کوئی جواب موصوف سے نہ بن پڑا کیونکہ دلائل ہی دندان شکن تھے، لہٰذا منہ بسورتے ہوئے اپنا آقا مائیکل ایڈوائر کے آشیانے

پر ناصیہ فرسائی کرنے گئے "کہ اوں اوں اوں! دیکھیے ظفر علی خان ہمیں مارتا ہے۔" ظفر علی خان اپنے اداریے میں مزید لکھتے ہیں:

> "سر مائیکل پہلے ہی ہم سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، پنجے جھاڑ کر جھٹ ہمارے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے کہ "اوہو" اس کا بھی یہ منہ ہے کہ ہمارے وفادارانِ ازلی و نمک خوارانِ سرمدی کے منہ آئے۔ ہم ابھی اس زبان دراز کا ناطقہ بند کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ سر رشتہ سی۔ آئی۔ ڈی کی شاخ مطبوعات کی وساطت سے ہمیں حکم ملا کہ "اگر تم نے مسیح موعود کی قادیانی بھیڑوں اور ان کے مقدس چرواہے مسٹر مرزا بشیر الدین محمود کو چھیڑا تو تمہاری زبان عرضہ مقراض سنسر بن جائے گی۔" ہم نے بہتیرا کہا کہ "اجی صاحب! یہ تو مذہبی جھگڑے ہیں، انھیں سیاست سے کیا تعلق؟ آپ کیوں اس پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں اور مسٹر مرزا کو تو نمک اور ہمیں سیندور کھیلاتے ہیں۔" لیکن ہماری ایک نہ سنی گئی اور ہمیں طوعاً و کرہاً مسٹر مرزا پر اعتراض سے سر مائیکل کی سرکار کے حکم سے رکنا پڑا۔"(۲۶)

الغرض انہی حالات کے پیش نظر ۱۹۱۸ء کے اوائل میں مولانا ظفر علی خان کو "ستارۂ صبح" بند کرنا پڑا۔

## حوالہ جات


۱۔ بحوالہ: عبد السلام خورشید، ڈاکٹر؛ "کاروانِ صحافت" کراچی، انجمنِ ترقی اردو؛ سال ۱۹۶۴ء؛ ص:۴۵

۲۔ ایضاً؛ ص:۴۱

۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر؛ "ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر"؛ لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب؛ ۱۹۶۷ء؛ ص:۶۵

۴۔ ایضاً؛ ص:۶۸

۵۔ ایضاً؛ ص:۶۸

۶۔ ظفر علی خان، مولانا؛ "رسالہ: افسانہ"؛ حیدر آباد دکن، مطبع حیدر آباد دکن پریس؛ جولائی ۱۹۰۲ء ص:۱

۷۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر؛ "کاروانِ صحافت"؛ ص:۱۲۴

۸۔ "ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر"؛ ص:۳۰۶

۹۔ "دکن ریویو"؛ جنوری ۱۹۰۴ء؛ص:۱

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ بحوالہ: "ایڈیٹوریل: دکن ریویو"؛ شمارہ جنوری ۱۹۰۸ء؛ص:۱

۱۲۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛ "ظفر علی خان: حیات۔ خدمات۔ آثار"؛ص:۵۷

۱۳۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛ "ظفر علی خان۔ ادیب و شاعر"؛ص:۷۰

۱۴۔ بحوالہ "کاروانِ صحافت"؛ص:۱۳۰

۱۵۔ بحوالہ "دکن ریویو"؛ شمارہ: جنوری ۱۹۰۸ء

۱۶۔ عبدالسلام خورشید' ڈاکٹر؛ "کاروانِ صحافت"؛ص:۱۳۳

۱۷۔ ابوالکلام آزاد؛ "الہلال"؛ کلکتہ؛ ۲۱ جنوری ۱۹۱۴ء

۱۸۔ شورش کاشمیری؛ "ظفر علی خان"؛ص:۹۶

۱۹۔ ماہنامہ: "شاہکار"؛ لاہور؛ اپریل ۱۹۳۵ء

۲۰۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛ "ظفر علی خان: حیات۔ خدمات و آثار"؛ص:۸۷

۲۱۔ ایضاً؛ص:۱۲۲

۲۲۔ ایضاً؛ص:۱۲۵

۲۳۔ عبدالسلام خورشید' ڈاکٹر؛ "کاروانِ صحافت"؛ص:۱۳۷

۲۴۔ غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر؛ "ظفر علی خان: حیات۔ خدمات و آثار"؛ص:۱۲۹

۲۵۔ ظفر علی خان' مولانا؛ "شریعت اور طریقت کی آویزش: مشمولہ: نگارستان"؛ لاہور' ظفر علی خان ٹرسٹ؛ ۲۰۱۰؛ص:۳

۲۶۔ ظفر علی خان' مولانا؛ "اداریہ: روزنامہ زمیندار"؛ لاہور: ۲۵ جون ۱۹۲۰ء

ڈاکٹر احسان اللہ طاہر
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج فار بوائز، سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ
بابر حسین
اسکالر پی ایچ ڈی اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

# محمد اقبال نجمیؔ کی حمد نگاری

## Characteristic Features of "Hamd" written by Iqbal Najmi

Poetry in Praise of Almighty Allah written by Muhammad Iqbal Najmi, has been reviewed with introductory feature and life sketch of the poet. 10 books of Praise Poetry, in Punjabi and Urdu languages are on credit of Iqbal Najmi. Two books i.e. Hamdia Diwan and Hamdia Hike made the poet a pioneer in the domain of Punjabi poetic history. Riyaaz-e-Hamd, a book containing praise poetry, is also termed first one written as long poem in one prosodic metre.

**Keywords:** *Poetry, Languages,Poet, Diwan, History, Prosodic.*

### خاندانی پس منظر

محمد اقبال حسین ۴جنوری ۱۹۵۳ء بروز اتوار اپنے ننھیال مدر چک، پتوکی ضلع لاہور میں پیدا ہوئے۔ محمد اقبال حسین کا بچپن عام بچوں کی طرح ہی گزرا۔

اپنے خاندان کے بارے میں محمد اقبال نجمیؔ نے ایک انٹرویو میں بتایا:

"قیامِ پاکستان سے قبل امرتسر کے ایک گاؤں میں ایک کشمیری خاندان آباد تھا، جس کے سربراہ رحیم بخش تھے جو کہ کپڑے کا کام کرتے تھے۔ ان کے چھ بچوں میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام محمد اسماعیل، نبی بخش اور نذیر حسین تھے۔ محمد اسماعیل سب سے بڑے تھے اور محکمہ مال میں پٹواری تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان سمیت ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے اور پاجیاں (موجودہ رائے ونڈ) میں پٹواری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی دوران انہوں نے مہاجرین میں سامان کی تقسیم کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ نے ملازمت کا یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء تک جاری رکھا۔ "

اپنے خاندان کے بارے میں محمد اقبال نجمیؔ مزید بتاتے ہیں:

"محمد اسماعیل نے ۱۹۵۳ء میں ملازمت سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے خاکوانی مارکیٹ کھجور منڈی گوجرانوالہ میں کپڑے کا کام شروع کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ مستقل رہائش ۸۸ بی سیٹلائٹ ٹائون گوجرانوالہ منتقل کر لی۔انہوں نے تین شادیاں کیں۔پہلی بیوی سے ان کی ایک بیٹی زینت النساء تھیں جو کہ راہی ملکِ عدم ہو چکی ہیں جبکہ دوسری بیوی سے ان کے بچے محمد اکرام، بشریٰ بیگم، خوشنودہ بیگم اور خالدہ جبیں ہیں۔محمد اسماعیل کی تیسری شادی فاطمہ بی بی سے ہوئی جن کے بطن سے محمد اقبال حسین، نصیر بیگم، احمد حسن اور عابدہ پروین ہیں۔"

اس طرح محمد اقبال حسین اپنے بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہیں۔محمد اکرام ان سے بڑے اور احمد حسن چھوٹے ہیں۔

اپنی تعلیم کے بارے میں ایک انٹر ویو میں انہوں نے بتایا کہ

"گھریلو ماحول مذہبی ہونے کی وجہ سے میری تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے کیا گیا۔میں نے قرآن مجید (ناظرہ) کے ابتدائی اسباق اپنی دادی محترمہ حاجن حشمت بی بی سے پڑھے۔بعد ازاں حافظ محمد خاں صاحب سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی۔دینی علوم سے آگاہی الحاج حافظ نذیر احمد نوری سے ملتی رہی۔اپنے وقت کے ممتاز اور جید عالم دین مولانا خواجہ محمد قاسمؒ سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا جبکہ گھر پر میری روحانی تربیت کا بیڑا میری دادی محترمہ نے اٹھایا جو کہ ایک سُلجھی ہوئی اور دیندار خاتون تھیں۔"

یہ ان بزرگوں کا روحانی فیض اور ان کی تربیت کا اثر ہے کہ آج محمد اقبال حسین کو قرآن و حدیث اور اسلامی تعلیمات سے والہانہ عشق ہے۔دنیاوی تعلیم کی ابتدا کے بارے میں محمد اقبال حسین نے ایک انٹرویو میں بتایا:

"دنیاوی تعلیم کا آغاز گھر پر ہی ہوا اور میں نے پہلی کلاس گھر میں ہی اپنی بڑی بہن سے پڑھی۔دوسری کلاس میں مجھے گورنمنٹ ایم سی پرائمری سکول سیٹلائٹ ٹائون گوجرانوالہ میں داخل کروایا گیا۔کلاس چہارم تک میں نے اسی سکول میں تعلیم حاصل کی۔لیکن جب میں پانچویں کلاس میں پہنچا تو یہ سکول بعض وجوہات کی بنا پر بند کر دیا گیا۔بعد ازاں مجھے گورنمنٹ کالج فار بوائز گوجرانوالہ کے

مقابل برانچ نمبر ۷ کارپوریشن سکول میں پنجم کلاس میں داخل کروایا گیا۔ پھر اسی سکول سے میں نے پانچویں کا امتحان پاس کیا۔"

مڈل کی تعلیم کے لیے گھر والوں نے آپ کو گورنمنٹ محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں داخل کروایا۔ اسی عرصہ میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے تعلیمی عمل میں ایک عارضی تعطل آیا۔

جنگ کے دوران محمد اقبال حُسین نے اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی اور اس سلسلے میں ایک معقول رقم جمع کر کے حکومتی خزانے میں جمع کروائی۔ ان کے دل میں موجود یہی جذبہ حب الوطنی بعد ازاں آپ کی شاعری میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔

گورنمنٹ محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول سے مڈل کا امتحان ۱۹۶۷ء میں پاس کرنے کے بعد آپ کو ثانوی تعلیم کے حصول کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ میں داخل کروا دیا گیا۔ آپ نے اسی سکول سے مولوی عبداللطیف قریشی جیسے شفیق، محنتی اور کہنہ مشق استاد کی نگرانی میں ۱۹۶۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ نے گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں داخلہ لیا، لیکن آپ زیادہ دیر تک کالج کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور گھریلو ذمہ داریوں کے سبب کالج کی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔

**ادبی زندگی کا آغاز**

اپنی ادبی زندگی کے آغاز کے بارے میں محمد اقبال نجمی کہتے ہیں:

"۱۹۷۳ کا سال میرے لیے روحانی کیف اور دلی شادمانی ساتھ لایا کیوں کہ اس سال کی کچھ مبارک ساعتوں نے مجھے شعر لکھنے کی طرف راغب کیا۔ میں اس وقت بحیثیت ٹیچر سکول میں ملازمت کر رہا تھا۔ سکول میں بچوں کی تفریح کے لیے درمیانی وقفہ چل رہا تھا۔ میں اخبار کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ اخبار کے صفحے پر کچھ اشعار درج تھے۔ میں نے انہیں پڑھا بلکہ کئی بار پڑھا اور پھر میرے ذہن نے ایک شعر پر ٹھہر کر کہا کہ اسے ایسے نہیں، اس طرح ہونا چاہیے۔ مجھے سوچنے کا یہ عمل اچھا لگا اور پھر میں نے اشعار کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میری دوستی شعر اور کتابوں سے پہلے بھی تھی

مگر وہ صرف پڑھنے کی حد تک تھی۔اب اس میں ایک تبدیلی آ گئی۔میں نے خود سے مکالمہ کیا۔اقبال تم بھی شعر لکھ سکتے ہو تم بھی لکھو اور میں نے اس پر عمل شروع کر دیا"

شاعری میں اپنے استاد کے بارے میں محمد اقبال نجمیؔ بتاتے ہیں :

"میں نے ابتدائی طور پر امین خیالؔ سے اصلاح لی انہوں نے مجھے پنجابی لکھنے پر مائل کیا۔مگر شعری رموز سمجھانے میں وہ میری مدد نہ کر سکے۔ان کے بعد میں نے پروفیسر منصور احمد خالدؔ سے ابتدائی باتیں سیکھنا چاہیں، مگر ان کی مصروفیات کی وجہ سے انہی صرف چند غزلیں ہی دکھا سکا۔پھر میرا پروفیسر محمد اکرم رضاؔ سے رابطہ ہو گیا، ان سے استفادہ کیا۔انہوں نے میری کتابوں پر نظرثانی فرمائی اور مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔جہاں تک شعری تربیت یا فنی رموز سمجھنے کا تعلق ہے تو یہ ہم دوستوں نے جن میں غلام مصطفی بسملؔ، بشیر عابدؔ، امجد حمید محسنؔ شامل تھے، مل بیٹھ کر مشقیں کیں۔بشیر عابدؔ نے اس سلسلے میں معاونت کی کیونکہ وہ عروض سے آشنا تھے۔"

محمد اقبال حسین نجمیؔ شروع شروع میں "اقبال" تخلص استعمال کرتے تھے۔"نجمیؔ" تخلص کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ صحرائی گورداسپوری (مرحوم) نے مجھے مشورہ دیا کہ تم نجمیؔ تخلص رکھ لو۔کوئی نیا شعر کہنے یا نظم یا غزل مکمل کرنے کے بعد اپنے محسوسات کے بارے میں محمد اقبال نجمیؔ کہتے ہیں کہ تخلیق کا عمل ایک خوشگوار اور پرمسرت عمل ہے۔اس کا ذائقہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اپنا ایک ہائیکو اس سلسلے میں گوش گزار کرتا ہوں۔

جب نئی کوئی بات کرتا ہوں
میں سنورتا ہوں میں نکھرتا ہوں
میرے اندر بھی رت بدلتی ہے

محمد اقبال نجمیؔ علامہ محمد اقبالؔ کی فکری تحریک سے بہت متاثر ہیں۔انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ

"متاثر تو مجھے بہت سے شعرا نے کیا ہے مگر میری روح میں کلامِ اقبال اتر چکا ہے اور وہ بھی جس قدر میں اسے سمجھ چکا ہوں۔میری نظر میں اردو ادب میں اقبالؔ سے بڑا کوئی شاعر نہیں۔اقبالؔ آفاقی شاعر ہیں۔ان کے کلام سے ابھی درست طریقے سے استفادہ نہیں کیا گیا۔"

محمد اقبال نجمی کی حمد نگاری

"حمد چراغ دلاں دا چانن" محمد اقبال نجمی کا اولین مجموعہ حمد ہے جو کہ پنجابی میں سب سے پہلا حمدیہ مجموعہ شمار کیا جاتا ہے۔پنجابی میں پہلا باقاعدہ حمدیہ مجموعہ پیش کرنے کی سعادت قدرت نے محمد اقبال نجمیؔ کے مقدر میں رکھی تھی۔(۱)

اس مجموعے میں انہوں نے مثنوی، پابند نظم، آزاد نظم، گیت، قطعہ اور کئی دوسری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد رقمطراز ہیں:

> "حمد چراغ دلاں دا چانن" کی شاعری اپنے خالق سے ایک مسلسل مکالمہ ہے۔ جس مکالمے میں جہاں اللہ کی عظمت و کبریائی اور اس کی صفات کا مبارک تذکرہ ہے وہیں ربِ کائنات کی صنعتِ کاملہ کے مختلف مظاہر کے حسن و جمال کا مرقع بھی۔اس زمانے کے دُکھ درد اور مسائلِ حیات کا بیان بھی ہے اور ان سے بچ نکلنے کی دعا اور التجا بھی۔یوں مجموعی حوالے سے یہ مجموعہء حمد، ایمان اور ایقان کی ایک ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جو کاروبارِ شوق کو نئی منزلوں سے ہمکنار کرتا ہے"۔(۲)

مذکورہ کتاب ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔حمد نگاری کی طرف یہ ان کا پہلا قدم تھا۔جہاں یہ کتاب پنجابی ادب میں پہلی حمدیہ کتاب ہے وہیں موصوف کی بھی پہلی حمدیہ کتاب ہے جو کہ حمد کے حوالے سے منظرِ عام پر آئی۔اس میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ خدائے وحدہٗ لا شریک کی حمد کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنائیں۔آپ نے حمد کو دلوں کا نور اور روشنی کہہ کر رات کے مسافروں کو ایسی روشنی اور نوری کرنوں سے واقفیت دی ہے کہ پڑھنے والوں کو ایک قوت اور طاقت ملتی ہے۔"حمد چراغ دلاں دا چانن" کی ایک ایک کرن ، ایک ایک لاٹ اُس مالک و خالق کی کبریائی، ربوبیت اور غفاری و ستاری کی بات کرتی دکھائی دیتی ہے۔

یہ کتاب تخلیق کار کے ایمان، ایقان، عشق اور عقیدت کی روشنی، اس کے یقین، اعتماد، اور پیار کا روشن استعارہ ہے۔اس روشنی اور پیار کا سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گا۔اس کی ہر

کرن اپنے اندر ایک دل اور ہر دل اپنے اندر ایک چراغ رکھتا ہے جو اپنے قاری کو اپنے مالک و خالق کے ساتھ اس کا تعلق اور بندگی کا رشتہ یاد کرواتا رہتا ہے۔اکبر علی غازی اس حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> "حمد چراغ دلاں دا چانن" پڑھ کر اقبال نجمی کے گہرے مذہبی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کے کلام میں بار بار اور جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کامل کا اظہار اور اس کی تخلیق کا وجود میں آ کر اس کے نام کو یاد رکھنے سے زندہ رہنے کا ذکر ملتا ہے"۔[۳]

اگر فنی حوالے سے اس کتاب کو دیکھا جائے تو اس میں نظمیں، غزلیہ رنگ، ماہیے، قطعات، چومصرعے، مثنوی الغرض ہر صنفِ ادب میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔محمد اقبال نجمی نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے جس بھی صنف کو منتخب کیا ہے، فنی حوالے سے اس کے سارے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔آپ کی اس کتاب کے بعد آپ نے بھی اور دوسرے پنجابی شعراء نے بھی حمد کے حوالے سے کام شروع کیا اور آج آپ کی اسی تحریک کی وجہ سے اس صنف کے حوالے سے پنجابی ادب میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک کام ہو چکا ہے۔"نغمہء حمد (اردو)" ۲۰۰۵ء میں محمد اقبال نجمی کی منظرِ عام پر آنے والی حمدیہ تخلیق ہے۔یہ موصوف کی اردو ادب میں پہلی اور مجموعی طور پر دوسری حمدیہ کتاب ہے۔محمد اقبال نجمی اللہ رب العزت کے در پہ جھکنے کو ہی قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے اپنے قاری کو بھی اسی طرف لاتے ہیں۔ان کو اس بات کی خبر ہے کہ آج تک دنیا میں جس نے بھی عزت و توقیر اور لوگوں کے دلوں میں جگہ پائی ہے اس کا سبب خدا کے آگے سجدہ ریز ہوناہی ہے۔انہوں نے اپنے اس مجموعہء حمد میں اپنے قاری کو اپنی مناجات ، دعاؤں اور التجاؤں کے قرینے اور طریقے بتائے ہیں۔وہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہوئے کہتے ہیں :

مری التجائیں سن لے مری سب دعائیں سن لے
تری مغفرت کا طالب تجھے حالِ دل سناؤں
مجھے جو بھی مانگنا ہے ترے در سے مانگنا ہے
ترے در پہ اپنا دامن میں اسی لیے بچھاؤں[۴]

موصوف نے اپنی اس کتاب میں صنفی حوالے سے دوہے پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دوہے میں پہلا مصرع دوسرے مصرعے کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ دوسرا مصرع پہلے کی تکمیل۔ آپ نے دوہا لکھتے ہوئے اس میں جدّت پیدا کر دی ہے۔ آپ کے حمدیہ دوہوں میں خالق اور مخلوق کے درمیان ایک مضبوط رشتہ پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے آپ کے چند دوہے، جو موضوع پر گرفت اور صنفِ سخن پر مکمل عبور کا ثبوت ہیں، ملاحظہ فرمائیں:۔

تو واحد تو یکتا مولا تیرا ذکر کتاب
ہر اک جز میں شامل دیکھوں مولا تیری ذات
ہر خلوت میں ہر جلوت میں تیری ذات سوال
تجھ کو ڈھونڈیں پل پل مولا میرے خواب خیال(٥)

"نغمہء حمد" ایک ایسا نغمہ ہے جس کے سُروں میں دوہے، رباعی اور قطعات کے علاوہ اور بھی کئی اصناف شامل ہیں۔ رباعی بحر ہزج میں ہوتی ہے اور اس کے چوبیس اوزان ہوتے ہیں۔ یہ ایک مشکل صنفِ سخن ہے مگر محمد اقبال نجمی نے بڑی آسانی کے ساتھ اس میں خدائے واحد و یکتا کی حمد لکھی ہے۔ "نغمہء حمد" میں ان کی ایک رباعی یوں ہے:

میں حمد جو لکھوں تو ہے تیری رحمت
میں نعت جو لکھوں تو ہے تیری شفقت
قدرت ہے کہاں مجھ میں ثنا تیری کروں
یارا ہے قلم کو نہ زباں میں طاقت (٦)

"نغمہء حمد" میں محمد اقبال نجمی نے ہر صنف میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اردو ادب میں موصوف کی پہلی کتاب تھی جس میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ بڑوں اور بچوں کے لیے بھی لکھا جائے اور اردو ادب کی کوئی صنف حمدِ باری تعالیٰ کے ذائقے سے محروم نہ رہے۔ اس لیے اس میں انہوں نے قطعات اور سانیٹ میں بھی لکھا ہے۔

"قطعہ کے لغوی معنی "ٹکڑا یا جزو" کے ہیں۔ اصطلاح میں قطعہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل بیان کیا گیا ہو۔ قطعے میں مطلع کی موجودگی ضروری نہیں۔ قطعے کے ہر شعر کے

دوسرے مصرع میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔گویا قطعے کی ہیئت قصیدے کی ہوتی ہے مگر قطعے میں مطلع نہیں ہوتا۔قطعہ ہر بحر میں کہا جا سکتا ہے۔قطعہ کم از کم دو شعروں کا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں۔"(٧)

جام مجھ کو بادۂ رحمت سے ملنا چاہیے
جو مجھے سرشار رکھے مولا تیرے پیار سے
تیری چاہت میں رہوں اب ہر گھڑی مشغول میں
میرے مولا مجھ کو رکھنا دور ہر آزار سے(٨)

اسی طرح اس میں" سانیٹ" کی ہیئت میں بھی حمد ملتی ہے۔یہ اگرچہ ایک انگریزی صنف ہے مگر اس میں بھی موصوف نے بڑے خوبصورت انداز میں اپنے حمدیہ افکار کا اظہار کیا ہے۔

"سانیٹ دورِ جدید کی پیداوار ہے۔اسے نظم ہی کی ایک شکل کہہ سکتے ہیں۔سانیٹ ایک طرح کی مقفّٰی نظم ہے جس میں کل چودہ مصرعے ہوتے ہیں۔اس میں قافیے ایک مقررہ ترتیب سے لائے جاتے ہیں۔سانیٹ کے دو حصے ہوتے ہیں۔پہلا حصہ آٹھ مصرعوں پر اور دوسرا حصہ چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔سانیٹ میں کسی خیال یا جذبے کو پیش کیا جاتا ہے۔سانیٹ کسی بھی وزن اور بحر میں لکھی جا سکتی ہے۔(٩)

اس کے علاوہ آپ کے اس مجموعہء حمد میں تین نظمیں،" تحمید"،" اے خدا میرے خدا"، اور" پہچان" شامل ہیں۔ان آزاد نظموں میں بھی محمد اقبال نجمی نے اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا ہے۔آپ نے اپنی اس کتاب میں جو شاعری بچوں کے لیے کی ہے وہ اپنی سادگی اور تازگی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔آپ چونکہ بچوں کی نفسیات کو بڑا قریب سے جانتے ہیں اور اپنی زندگی کے چھبیس سال ان کی درس و تدریس میں گذارے ہیں، اس لیے ان کی لسانیات اور زبان و بیان کے تقاضوں سے خوب واقف ہیں۔اسی لیے ان کی مذکورہ شاعری ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے کیوں کہ آپ نے اپنے کلام کے ذریعے بچوں کے اذہان میں خدا کے تصور کو بہتر طور پر نقش کیا ہے۔بچوں کے لیے لکھی گئی حمدیہ نظمیں ان کے فن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

حق کا سپاہی مجھ کو بنا دے

دولت عمل کی میرے خدا دے
نیکی کا رستہ مجھ کو دکھا دے(۱۰)

"اُچی ذات کمالاں والی" محمد اقبال نجمی کے حمدیہ قصائد پر مشتمل کتاب ہے۔ اس میں موصوف نے ۱۴ قصائد لکھے ہیں۔ یہ کتاب۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی اور حمدیہ قصائد کے حوالے سے یہ پنجابی ادب میں پہلی کتاب ہے اور شاید ابھی تک آخری بھی۔اس کتاب کا دیباچہ پروفیسر محمد اکرم رضا اور ڈاکٹر بشیر عابد نے تحریر کیا ہے۔اول الذکر نے اسے محمد اقبال نجمی کی فکری اٹھان اور ثانی الذکر نے پنجابی حمدیہ قصائد میں اسے پہلا مجموعہ قرار دیا ہے۔پروفیسر محمد اکرم رضا اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"اُچی ذات کمالاں والی" ایک شمعِ ہدایت کی صورت ہے جو کہ بے شمار گمراہوں کو شعورِ منزل بخشتی ہے۔میری دُعا ہے کہ زمانہ اس شعری مجموعے کے خالق کا ہم نوا بن کر ساری دُنیا کے خالق و مالک کی پناہ میں آ جائے۔ جس کو دوام اور ہیشگی حاصل ہے اور جو اس کا ہو جاتا ہے وہ مالک بھی اسے ابدی زندگی کا اسلوب عطا کرتا ہے۔"(۱۱)

پنجابی زبان میں ابھی تک کسی اور شاعر نے اس طرح کی شاعری نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مالک و مختار نے محمد اقبال نجمی کے مقدر میں ہی ایسی انفرادیت لکھی ہے کہ وہ کئی حوالوں سے اُردو اور پنجابی ادب میں منفرد دکھائی دیتے ہیں۔کسی کو کیا ملا یہ مقدر کی بات ہے۔وہ خدائے وحدہٗ لا شریک کی حمد بیان کرتے ہوئے نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کا ذکر کرنا کبھی نہیں بھولتے۔

شان عظیم اے تیری مولا بخشیا پاک حبیب ﷺ
تیری حمد چتارے دل ایہ، آکھے پاک درود(۱۲)

ڈاکٹر بشیر عابد آپ کے ان قصائد کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"اگر ان سارے قصائد پر فکری و فنی اعتبار سے نظر دوڑائیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قصیدے کا ہر شعر کہیں مطلع ،کہیں تشبیب، کہیں گریز، کہیں مدح، کہیں حسنِ طلب اور کہیں دُعا ہے اور اس کے حُسن کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمتیں، بخششیں انعام کے ساتھ ساتھ آخرت میں جنت کی نعمتیں مانگنے کا بڑا سچا ذریعہ بھی۔"(۱۳)

محمد اقبال نجمی نے اپنے ہر حمدیہ قصیدے میں الگ بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے اپنے آخری قصیدے میں اللہ رب العزت کے ۹۹ اسمائے حسنہ کو بڑی فنکاری اور ہنرمندی سے معنوی انداز میں استعمال کیا ہے۔ آپ نے اپنے ان قصائد میں دین اسلام کے بنیادی عقائد اور محبتِ رسول ﷺ کے سارے پہلوئوں کو بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے موصوف نے اپنے مالک و خالق کے ساتھ وعدہ کیا ہو کہ وہ اسے دولتِ فن دیتا جائے اور وہ اس فن کو اس کی کبریائی کے اظہار اور اس کے محبوب کی مدحت و ثناء میں لگاتا جائے گا۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے قاری کو ایمان کی پختگی اور افکار کی تازگی جیسے خیالات عطا کر کے قاری کو یقین اور ایقان کی دولت بانٹی ہے۔ محمد اقبال نجمی کے یہ قصائد ہمیں ایمان کی مضبوطی اور اللہ کی رحمتوں کے قریب کرتے ہیں۔

عقل قیاس توں اُچے ہوندے اوہدے کم نیں سارے
اوہ اے اچیاں شاناں والا، اوہدے کاج نرالے
ہر عاجز تے بے بس دا تے اوہو حامی ڈِٹھا
دور کرے محتاجی سبھ دی نعمت جام اچھالے (۱۴)

محمد اقبال نجمی کی یہ کتاب زبان و بیان ، اسلوب اور پیش کش کے حوالوں سے اپنے اندر کئی خوبصورت پہلو رکھتی ہے۔ آپ نے جہاں قصیدے کی صنف کو بھرپور انداز میں نبھایا ہے وہاں فکری حوالے سے اس میں کئی خوبصورت اضافے بھی کیے ہیں۔ آپ نے عقائد، عقیدت اور اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کو تخلیق کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں موضوعات کا تنوع دکھائی دیتا ہے۔

۲۰۰۹ء میں "ریاضِ حمد" کے نام سے محمد اقبال نجمی کی ایک اور حمدیہ کتاب منصہ شہود پر آئی۔ایاز بشیر نے اپنے ایم فِل کے مقالے میں لکھا ہے:

"محمد اقبال نجمی کی حمد میں خوبصورت تراکیب و اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ مذکورہ فنی تقاضوں کو نبھاتے ہوئے وہ ہر سطح پر ہمیں ایک نیا تخلیقی منظر نامہ بناتے ملتے ہیں۔ تلمیحات کے استعمال میں تو انہوں نے ہر شعر میں ایک نیا مذہبی اور دینی پس منظر دکھانے کی کوشش

کی ہے اور پھر ان تلمیحات میں بھی موصوف نے ایک نئی ترکیب استعمال کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ محمد اقبال نجمی کی حمدیہ کتب میں استعمال ہونے والی چند ایک نئی اور روایتی تراکیب و اصطلاحات کچھ یوں ہیں۔

شعورِ ذوقِ فطرت، جمالِ نورِ وحدت، نویدِ جانفزائی، سرُورِ بادئہ عرفاں، نمودِ سرخوشی، بہارِ دلنشیں، تقدس کی ضیا باری، گلِ خنداں، ہجومِ غم، دلِ بیدار، بہارِ باغِ ایماں، سُوئے دل، لذتِ بندگی، جادئہ رحمت، سازِ جاں، ذوقِ رعنائی، شانِ گویائی، بادئہ وحدت وغیرہ قابل ذکر ہیں"۔(١٥)

سرُورِ بندگی ہم کو عطا کر
نمودِ سرخُوشی ہم کو عطا کر(١٦)

زبان و بیان کے حوالے سے اپنی تخلیق کو امر کرنے کے لیے ہر تخلیق کار شعوری طور پر کچھ ایسی کوششیں کرتا ہے کہ اس کی تخلیق شاہکار کے زمرے میں آئے یا لسانی و فنی حوالے سے اس کی بازگشت ایک عرصے تک سنائی دیتی رہے۔ اس حوالے سے محمد اقبال نجمی نے صنعتِ تضاد کو کئی طریقوں سے اپنی حمد میں استعمال کیا ہے۔ کہیں تو وہ حروفِ عطف سے اسے استعمال کرتے ہیں تو کبھی ردیف و قافیے میں اس کا خوب استعمال لاتے ہیں۔ اسی طرح موصوف نے مرکبِ اضافی کے استعمال سے مترادف اور متضاد کو بھی خوب استعمال کیا ہے۔ نمونہء کلام دیکھیے:

ترا قبضہ دلوں پر ہے خدایا
تجھے ہی علم ہے سود و زیاں کا
تو رب العالمیں ہے میرے مولا
تو ہی رازق ہے ہر خورد و کلاں کا(١٧)

اس کے علاوہ بھی موصوف کی حمدیہ کتب میں کچھ ایسے ہی مرکبِ توصیفی، مرکبِ اضافی اور حرفِ عطف کے استعمالات دکھائی دیتے ہیں جو کہ ان کی حمد کو فنی حوالے سے چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فنی طور پر پختہ ہونے اور اپنے کلام کو شعوری طور پر سنوارنے کا عمل

شاعرانہ سطح پر برابر دکھائی دیتا ہے۔موصوف نے ایسی حمدیہ غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں دو دو مرتبہ قافیے کا استعمال کیا گیا ہے جو کہ ایک نیا تجربہ بھی ہے اور ان کی فنی انفرادیت بھی۔مثلاً

تری جلوت، جلالت کے نشاں ہیں
تری الفت، لطافت کے نشاں ہیں
سبھی جلوے زمین و آسماں کے
تری قدرت، مشیت کے نشاں ہیں
پہاڑوں، آبشاروں کی بلندی
تری سطوت، فضیلت کے نشاں ہیں(۱۸)

اسی طرح کی کچھ اور تراکیب اور مرکبات سے موصوف نے اپنی حمدیہ شاعری کو مزین کیا ہے۔تاکیدِ لفظی اور تکرارِ لفظی کے ساتھ بھی محمد اقبال نجمی نے اپنی شاعری کو رواں دواں بنایا ہے۔ صنعتِ تضاد اور مترادف کی کچھ مثالیں دیکھیں۔ارض و سما، جود و سخا، لطف و کرم، صبح و مسا، رحم و کرم، قیاس و عقل، نطق و بیاں، لفظ و معانی، صبر و رضا،حمد و ستائش، لطف و عطا وغیرہ۔

بیاضِ دل پہ رقم ہے ترے جو یہ کلمہ
اجال صبح و مسا، لا الٰہ الا اللہ
ترے رحم و کرم کے ہم ہیں طالب
سلیقہ، التجا، حکمت عطا کر(۱۹)

حمدیہ ہائیکو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔موصوف نے کوشش کی ہے کہ ہر صنف میں حمدِ باری تعالیٰ کہی جائے۔اس حوالے سے ان کی یہ کوشش بھی اردو ادب پر ایک احسان ہے کہ اس سے پہلے اس صنف میں کتابی صورت میں حمد نہیں تھی۔محمد اقبال نجمی نے اپنی مذکورہ کتاب "حمدیہ ہائیکو" میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کی عظمت اور اس کے نور کو یوں بیان کیا ہے کہ بات دلوں پر اثر چھوڑتی ہے کیونکہ وہ بذاتِ خود بھی اسی نور سے ہدایت یافتہ اور فیض یافتہ ہیں اور دوسروں کو بھی اسی سرچشمہء ہدایت سے سیراب ہونے کی راہیں دکھاتے ہیں۔

تو بھی مولا نور
تیرا پاک نبی ﷺ بھی نور
نور ترا قرآن[٢٠]

آپ نے نسلِ نو پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہر دانش اور فکر کا منبع (Source) یہی نور ہے۔اسی سے دل و جاں روشن ہوتے ہیں۔اسی سے فکر وفن میں نکھار آتا ہے۔بعض دانشور اور نقاد یہ بات کرتے ہیں کہ محمد اقبال نجمی آئے دن کوئی نہ کوئی حمد و نعت کے حوالے سے کتاب لکھ دیتے ہیں۔ میں خود بھی انہی لوگوں میں سے تھا مگر مجھے حمدیہ ہائیکو پڑھ کر اس بات کا احساس ہوا کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی عقل کی بنیادہی قرآنی نور پر رکھی ہو وہ آئے دن تو کیا ہر دن بھی کتاب لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور یہ سب اسی نوروالے کی توفیق اور عطا سے ہوتا ہے۔جب یہ مبارک ذکر کسی کے دل میں اترتا ہے تو وہ انسان اہلِ علم اور اہلِ دل میں شمار ہونے لگتا ہے۔

"حمدیہ ہائیکو" میں محمد اقبال نجمی نے خدائے وحدہٗ لاشریک کی صفت و ثنا میں مناجات کو یوں بیان کیا ہے کہ ایک تو اس میں اجتماعیت دکھائی دیتی ہے اور دوسرا ان مناجات میں بھی اس خالق و مالک کی ثنا کے سارے رنگ اپنے عقیدے کی سچائی اور معطر مصرعوں کے ساتھ نظر میں ایک کہکشاں سجاتے چلے جاتے ہیں۔اس حوالے سے محمد اقبال نجمی کی انفرادیت یہ ہے کہ آپ نے ان ہائیکوز میں کسی بھی غیر ضروری مصرعے، لفظ اور خیال کو شامل نہیں ہونے دیا۔اگر فکری حوالے سے حمدیہ ہائیکو کا تجزیہ کیا جائے تو ان حمدیہ ہائیکوز میں انہوں نے یہی ایک بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سب علم و حکمت، دولتِ ایمان، ذوق و شوق اور خوف وہی اللہ عطا کرتا ہے۔

اپنی حکمت سے
بانٹ رہا ہے دانائی
اپنے بندوں میں[٢١]

اگر فکری حوالوں سے ان ہائیکوز کا تجزیہ یا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ہر مصرع، ہر لفظ نور میں ڈوبا ہوا، شعور کی گہرائیوں سے نکلا ہوا، ذاتی تجربات و مشاہدات کی واردات اور قلبی لگائو کی کہانی سناتا ہوا ملے گا۔ان ہائیکوز میں ہمیشہ زندہ رہنے والی روح ہے کیوں کہ جس کی حمد و ثناء میں لکھی گئی ہیں وہ

خدائے لم یزل حیی و قیوم ہے۔اس کی ہر بات ، ہر زبان میں کہی ہوئی تعریف نے زندہ رہنا ہے۔ محمد اقبال نجمی کی بدولت اردو ادب میں ہائیکو کا وجود ابدی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ اس صنف میں موصوف نے نعتیہ ہائیکو اور حمدیہ ہائیکو لکھ کر اس کو ایک طرح سے آبِ حیات پلا دیا ہے۔

سارے حرفوں میں
تیرا نور چمکتا ہے
میرے لفظوں میں

چھیڑ کے دل کے ساز
اس کی حمدیں گانا ہی
میرا ہے اعزاز

نعمتیں تو نے جو مجھے دی ہیں
شکر ان کا کیا ادا ایسے
آج تک غیر سے نہیں مانگا(۲۲)

"حمدیہ ہائیکو" میں عوام کے دل کی دھڑکنیں ہیں، عام انسان کی دعائیں ہیں، تمنائیں ہیں، آرزوئیں ہیں اور التجائیں ہیں۔ان کے الفاظ سے نکلنے والا نور، اہل نظر اپنے دل اور آنکھوں میں محسوس کرتے ہیں۔ان میں بناوٹ اور مصنوعی پن نہیں ہے۔یہ دل کی باتیں ہیں جو سیدھا دل سے نکل کر دل پر اُتر رہی ہیں اور ہر انسان کے دل کی آرزو بن رہی ہیں کیوں کہ ہر کوئی اُسی ایک اللہ سے مانگتا ہے جو سب کو عطا کرنے والا ہے۔مولا بخش کُشتہ نے پنجابی شاعری میں سب سے پہلے دیوان لکھا تھا۔(۲۳)

اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے دیوان میں بھی کیا۔موصوف کے بعد پنجابی شاعری میں کئی دیوان لکھے گئے ہیں جن میں ایک محمد اقبال نجمی کا ہے جو کہ "تن وستی وچ درد بلاواں" کے نام سے فروغِ ادب اکیڈمی گوجرانوالہ سے شائع ہوا تھا اور اب پنجابی حمد کی تاریخ میں محمد اقبال نجمی نے مولا بخش کشتہ والا کام کیا ہے یعنی انہوں نے حمد کا پنجابی میں سب سے پہلا دیوان لکھا ہے جس کو ایوانِ حمد

و نعت پاکستان گوجرانوالہ کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔"اللہ سوہنا" کے نام سے پنجابی ادب میں آنے والا یہ پہلا حمدیہ دیوان ہے جو ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔اس کا دیباچہ غلام مصطفیٰ بسمل نے "اللہ سوہنا"، پنجابی ادب وچ مڈھلا حمدیہ دیوان "کے نام سے تحریر کیا ہے۔اس میں(۹۵) پچانوے حمدیں ہیں،اور ہر حرف کی ایک سے زائد حمدیں ہیں۔مذکورہ کتاب کا انتساب اقبال نجمی کی حمد اور حمد نگاری سے محبت کا ثبوت لیے ہوئے ہے جو کہ یوں ہے:

اللہ سوہنا آکھن والیاں سبھ لوکاں دے ناں
اللہ سوہنا آکھن والیاں توں میں صدقے جاں[۲۴]

پنجابی شاعری پہ تنقید کرنے والوں کو ایک گلہ یہ بھی ہے کہ اس میں متنوع بحریں نہیں ہیں اور کہیں کہیں تو شعراء نے مکمل کتاب کو ایک ہی بحر میں لکھ دیا ہے۔محمد اقبال نجمی نے اپنے اس دیوان میں اس کمی کو بھی پورا کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ہر حمد کسی نئی زمین اور بحر میں ہو۔ موصوف کے لیے یہ کام اس لیے بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ اس سے پہلے پنجابی غزل کا ایک دیوان لکھ چکے تھے۔

اگر فکری حوالے سے اس دیوان کا تجزیہ کیا جائے تو اقبال نجمی نے اس میں اپنی زندگی کے سارے تجربات اور علم کو اکٹھا کر دیا ہے اور اس کے بیان کے لیے سالہا سال پر محیط ان کی دریافت بھی اس دیوان کو پنجابی ادب میں چار چاند لگا رہی ہے۔قاری ان کے اس دیوان سے اپنے دل میں ایک جوت سی جگتی ہوئی دیکھتا ہے، ایک لاٹ سی جلتی ہوئی محسوس کرتا ہے اور وہ اپنی ذات کو اس کے عشق کے موسم میں یوں معطر دیکھتا ہے کہ اگر کوئی اس سے ہم کلام ہو تو وہ اسے بھی اقبال نجمی کے الفاظ میں یہی کہتا ہے:

اپنی نسبت دی پکیائی اپنے دل توں پُچھ
اپنے اندر دی زیبائی اپنے دل توں پُچھ
روندی اکھ تے جھکیا ہویا سر اے جنہاں کول
کتھے لبھدے ایہہ سودائی اپنے دل توں پُچھ
وکھرے ای انداز نیں نجمی اوہدی بخشش دے

اوہنے رحمت کنج ورتائی اپنے دل توں بُچھ[٢٥]

محمد اقبال نجمی کی اکثر شاعری خواہ وہ غزل و نظم ہو یا ہائیکو اور قطعات، حمد و نعت ہوں یا دیگر پنجابی و اردو اصنافِ سخن، موصوف بڑی سادہ اور رواں دواں زبان میں لکھتے ہیں۔"اللہ سوہنا" میں بھی انہوں نے اللہ رب العزت کی صفات لکھتے ہوئے صفاتی ناموں کو ایک ہی حمد میں یوں لکھا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے روحانی وجد میں کھو جاتے ہیں۔ ایسی حمدیں ہمیں جہاں موصوف کی علمی و فکری وسعت سے آشنائی بخشتی ہیں وہیں ان کی روحانی حالت ،قلبی پاکیزگی اور پنجابی ادب میں بیان ہونے والے وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے نظریات سے ان کی گہری واقفیت سے بھی آگاہی دیتی ہیں۔

توں رحمن رحیم ایں مولا تیری ذات سمیع
توں قادر، قیوم ایں ربا تیری ذات بدیع
توں قدوس سلام وی ایں تے ماجد اتے مجید
توں خالق تے رازق داتا، تیری ذات شفیع
حشر دیہاڑے سبھ نے تکنی تیری شان قدیر
سبھناں تائیں کرے گی کٹھا تیری ذات جمیع[٢٦]

محمد اقبال نجمی پنجابی ادب کو پہلا حمدیہ دیوان "اللہ سوہنا" دیتے ہوئے اپنی پوری تخلیقی توانائی کو بروئے کار لائے ہیں۔انہوں نے اپنی پوری ادبی و فنی بصیرت و بصارت کو مکمل دیانت داری کے ساتھ استعمال کیا ہے کیونکہ وہ اس بات سے با خبر تھے کہ ایسی کتابیں ہمیشہ لوگوں کے دلوں اور حوالوں میں زندہ رہتی ہیں۔ یہ ایسے کام ہیں جو نیک اعمال میں شمار ہوتے ہیں اور نیک کمائی، بقول وارث شاہ ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں:

وارث شاہ اوہ سدا ای جیوندے نیں جنہاں کیتیاں نیک کمائیاں نی

محمد اقبال نجمی نے اردو ادب کو حمد و نعت کی کتابیں دینے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔جس تسلسل، روانی، انفرادیت اور فکری و فنی تنوع سے وہ ایسی کتب دے رہے ہیں،وہ سلسلہ اس لیے رکتا دکھائی نہیں دیتا کہ ان کی ہر نئی کتاب ایک نئے رنگ میں پیش ہوتی ہے اور قاری کویوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی پہلی تخلیق نے ان کو نئے راستے دکھائے ہوں۔اور ان سارے راستوں کی بنیاد وہ

سچائی، روحانی نظر اور باطنی صفائی ہے جو موصوف کو مسلسل حمد و نعت لکھنے سے مل رہی ہے اور وہ اس میں مسلسل اپنے قاری کو شامل کیے ہوئے ہیں۔

محمد اقبال نجمی نے ابھی تک اردو حمد و نعت میں جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ایک دو مضامین کی نہیں بلکہ مقالات کی متقاضی ہیں۔ آپ کے ادارے نے حمد و نعت اور ادب کے حوالے سے جو صحافتی و ادبی ، علمی اور تخلیقی سرگرمیاں کروائی ہیں وہ بھی کسی بڑے ادارے کے کام سے کم نہیں ہیں۔اگر آپ کی حمد کے حوالے سے ہی تخلیقات کو دیکھا جائے تو ہر جگہ اور ہر کتاب میں ہمیں ایک نیا رنگ دکھائی دے گا۔"اللہ الحمد" بھی حمد کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں انہوں نے ایک ہی نظم لکھی ہے اور یہ حمدیہ نظم ہے۔یہ فنی حوالے سے مسلسل نظم ہے جس کو ایک خاص عروضی وزن میں لکھا گیا ہے۔ردیف و قافیہ سے آزاد مگر ایک مخصوص ردھم میں چلتی ہوئی یہ نظم قاری کو ایک وجدانی کیفیت اور لطف سے ہمکنار کرتی ہے۔

اے الٰہ، اے خدا
نام تیرے سے ہے ابتداء تو ہے اللہ مرا
میں عبادت تری ہی کروں، اے الٰہ
نام تیرا جپوں، تجھ کو سجدہ کروں
تجھ سے مانگوں دُعا، تجھ سے مانگوں سدا
اے مرے کبریا، اے خدا اے الٰہ (۲۷)

محمد اقبال نجمی نے اس کتاب میں اللہ رب العزت کی عظمتوں، نعمتوں اوراحسانات کا ذکر بڑی عاجزی، انکساری اور محبت میں گُندھے ہوئے الفاظ سے کیا ہے۔ بحر میں اتنی روانی، سادگی، تیزی اور شگفتگی ہے کہ ہر خیال روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ہر بات من میں بیٹھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہر لفظ ذہن و دل پہ نقش ہو جاتا ہے اور اس بات اور فن کی دین کا اظہار بھی موصوف نے حمد لکھنے کو ہی کہا ہے:

غمزدہ قلب کو، دے خوشی، میرے معبود بس، ہے یہی التجا
سن گذارش مری، کر نوازش الٰہ،
لذتِ صدق دے

جو اُجالے مری فکر کو، دل سے
سارے تواہم کوتو دور کر
پر اثر ہو دُعا موجہء نور سے
رحمتِ خاص سے، میرے افعال کو
میرے اعمال کو نیکیوں میں بدل(۲۸)

جب ہم محمد اقبال نجمی کی اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی بھی بات شاعر کے دل کی نہیں بلکہ ہماری اپنی بات ہے، ہمارے دل کی آواز ہے۔ ہماری بے چین روح کو ایک سکون سا ملنا شروع ہو جاتا ہے اور ہم ان کی دعاؤں کے اس نہ ختم ہونے والے سلسلے میں اپنے آپ کو شامل کر لیتے ہیں جس کا آغاز محمد اقبال نجمی "اللہ الحمد" میں کرتے ہیں۔ یہ الفاظ اور افکار اپنی اس سچائی کی گواہی سے شاعر کے دل کی پاکی اور اللہ رب العزت کی حمد و ثنا کرنے کے لطف کی گواہی دیتے ہیں کہ کیسے خدائے وحدہٗ لاشریک کا ایک بندہ اپنے مالک و خالق کی حمد کرتا ہے اور اس کو پڑھنے والے پر بھی انہیں کیفیات کا نزول شروع ہوجاتاہے جو لکھنے والے پر ہوئی ہوتی ہیں۔

"عطائے ربُّ العالمین" حمدیہ قطعات پر مشتمل حمدِ رب العالمین ہے۔ خدائے لم یزل کی حمد و ثنا کرتے ہوئے محمد اقبال نجمی ہر وقت نہال دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دل میں یادِ الٰہی ایک دھمال سے اٹھتی ہے تو وہ وجد میں آ کر لفظوں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دل کو اس لازوال وظیفے میں ڈھال دیتے ہیں جو خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف سے بخشا گیا ایک پیارا سا ارمغاں ہے جو قلوب و اذہان کو ضوفشاں کر دیتا ہے۔ وہ خالق جسے چاہے اپنی چاہت کی سعادت بخش دے۔ وہی نعمتوں کے جام پلانے والا ہے۔ اسی کے کرم سے زندگیوں میں بہار آتی ہے اور رحمتوں کے پھول کھلتے ہیں۔ "عطائے ربُّ العالمین" ۲۰۱۹ء میں شائع ہونے والی حمدیہ قطعات پر مشتمل کتاب ہے جس کا انتساب" حمد و نعت کے خوبصورت شاعر حافظ لدھیانوی کے نام " سے موسوم ہے۔ موصوف نے حمد و نعت میں کام کرنے والوں ،اپنے جیسے محبت کرنے والوں اور اردو ادب میں لازوال حمدیہ و نعتیہ نقوش چھوڑنے والے لوگوں کو یاد رکھنے کی روایت خوب نبھائی ہے۔

۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۴ء کی طرح اس سال یعنی ۲۰۱۹ء میں بھی محمد اقبال نجمی نے بارہ کتابیں تخلیق اور شائع کی ہیں۔اس حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں:

"ہر پانچ سال بعد میں نے ایک سال میں بارہ کتب شائع کر کے تخلیقات کے حوالے سے اپنے بھرپور عزم کا اعادہ کیا ہے۔ اللہ کریم کی توفیق اور نبیء رحمت ﷺ کے دربارِ عالی مرتبت سے رہنمائی ملنا ہی میرے اس سفر کی معراج ہے۔اس علمی و ادبی سفر میں حمد و نعت کے حوالے سے میرا جو کام شائع ہوا وہ ادبی تاریخ کا ایک زرّیں باب ٹھہرے گا۔ان شا اللہ " (۲۹)

"عطائے رب العالمین" کی ابتداء میں ہی موصوف نے حمد لکھنے کے لیے جو دعا مانگی ہے وہی کتاب کا دیباچہ اور تقریظ ہے۔وہ دو قطعات ہی دعاؤں اور مناجات کے ایسے رنگ رکھتے ہیں جن میں شکر، حمد اور دعا اکٹھے ہو کر کسی لکھنے والے کو یقین، ایمان اور حق الیقین کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔

شکر تیرا کر رہا ہوں اے مرے ربِ کریم
حمد تیری جپ رہا ہوں اے مرے ربِ رحیم
حمد لکھنے کا قرینہ تو عطا کر دے مجھے
حمد تیری لکھ سکوں میں اے مرے ربِ عظیم

نور بخشا تو نے مجھ کو حمد لکھنے کے لیے
کی عطا مجھ کو بصیرت نعت کہنے کے لیے
میرے دل میں تو نے ڈالی حبِ مرسل کی ضیاء
دی زباں یہ مجھ کو اپنا نام جپنے کے لیے(۳۰)

محمد اقبال نجمی نے اپنی اس کتاب میں جو قطعات لکھے ہیں وہ ان کے دل کی آواز ہیں، ان کے اندر کا حال ہیں۔ہر قطعہ ان کے کردارِ زندگی اور شب و روز کا حال کہہ رہا ہے۔ابھی تک جس رفتار سے وہ حمد و نعت لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں،وہ ان ساری تخلیقات کو کرم، رحمت اور نعمت ہی

سمجھتے ہیں۔یہ قطعات فن کی ساری ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔ان کی سادگی اور تازگی تا دیر اردو حمدیہ قطعات میں اپنے آپ کو منواتی رہے گی۔

"حمدیہ ساقی نامہ" جنوری ۲۰۱۹ء میں منصہ شہود پر آئی۔یہ بھی حمدیہ تخلیق ہے۔اس کتاب کا نام سنتے ہی علامہ اقبال کی نظم "ساقی نامہ" ذہن میں آتی ہے جس میں انہوں نے اپنے عہد کے مسلمانوں کو خدا کی بندگی اور اطاعتِ رسول ﷺ یعنی کہ غلامیِ رسول ﷺ میں پختہ ہو کر آنے والے دور کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات کو محسوس کرنے اور اپنے آپ کو ان کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کی بات کی ہے۔ڈاکٹر بشیر عابد نے اپنے دیباچے میں اس کتاب کا تعارف یوں کروایا ہے:

> "محمد اقبال نجمی نے اپنے کلامِ تازہ "حمدیہ ساقی نامہ" کو بطور غزل مختلف قافیوں کے تحت سات سات اشعار میں مکمل کیا ہے۔انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اوصافِ کریمہ کو نہایت عمدگی سے پیکرِ اشعار میں ڈھالا ہے جس میں ان کی جودتِ طبع کی ہنرمندی نے بھی خدائے وحدہٗ لا شریک کی حمد و تسبیح کو بالکل منفرد انداز سے اشعار کی صورت مہکایا اور جگمگایا ہے کہ ہم اسے پڑھ کر قربِ الٰہی کے اور قریب ہو جاتے ہیں"۔[۳۱]

"حمدیہ ساقی نامہ" ایک طرح سے تین قسم کی شاعری لیے ہوئے ہے۔اس میں اللہ رب العزت کے آگے مناجات بھی دکھائی دیتی ہیں۔اس کے علاوہ اس کی نعمتوں پہ شکر کی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس کا بندہ ہونے کے ناطے اس کی حمد و ثنا تو ہم پہ ہر حال میں لازم ہے۔ان کے مانگنے کا انداز یعنی اندازِ مناجات اس کی حمد و ثنا اور تعریف کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

ترا تو بندہ چاہے ہے فقط تیری رضا ساقی
ہے میرے پاس جو کچھ بھی وہ تیری ہی عطا ساقی[۳۲]

کرم کے پانیوں سے دھو مری فردِ عمل ساقی
سہارا تو جو دیتا ہے تو جاتا ہوں سنبھل ساقی[۳۳]

تو ہی مالک، تو ہی قادر، تو ہی قیوم ہے خالق
سلامت رکھ مرا ایماں، مجھے عظمت تو دے ساقی(۳۴)

"حمدیہ ساقی نامہ" اردو ادب میں ابھی تک لکھی جانے والی حمدیہ کُتب میں انفرادیت کی حامل کتاب ہے۔اس میں فنی اور تجرباتی حوالے سے نیا پن ہے جو کہ تخلیق کار کی ادبی و تخلیقی فکر اور کہنہ مشقی کا زندہ ثبوت ہے۔اس حمدیہ نامے میں صرف حمد و ثنا کے پھول ہی نہیں کھلے بلکہ اس میں ہمیں نعتِ رسولِ کریم ﷺ کے جلوے بھی بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔فکر اور فن کے حوالے سے یہ ایک ایسی منفرد کتاب ہے جس کی سادہ اور عام فہم زبان قاری کے دل و دماغ پر لافانی اثر چھوڑتی ہے۔اس کتاب کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے تخلیق کار نے اپنے دل کا حال اپنے قاری کے سامنے رکھ دیا ہو اور ان خاص لمحوں کا اظہار بھی کر دیا ہو جن لمحاتِ حیات میں یہ خاص تخلیق وارد ہو رہی تھی۔"حمدیہ ساقی نامہ"کی ساری شاعری آمد کی شاعری ہے۔کبھی کبھی اسے پڑھتے ہوئے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ہی لمحے میں یہ سب کچھ لکھ دیا گیا ہو۔

تری حمد و ثنا لکھے کہاں نجمی ہے اس قابل
فقط دل پر میں لکھتا ہوں ترا حرفِ الٰہ ساقی(۳۵)

"حمدِربِ عظیم" خدائے وحدہٗ لاشریک کی حمد کاایک ایسا نغمہ ہے جو محمد اقبال نجمی ادب کی دنیا میں ہر وقت اپنے ہونٹوں پر سجائے نظر آتے ہیں۔آپ نے جس انداز سے اپنی کتاب "للہ الحمد" میں خدائے لم یزل کی تعریف کے لیے ایک لمبی نظم کا انتخاب کیا تھا اور پھر اسی میں اپنے فن کا حق ادا کر دیا تھاویسے ہی "حمدرب عظیم" بھی ایک ایسی نظم ہے جس میں بارگاہِ ایزدی میں تخلیق کار کے اندازِ منکسرانہ اور عاجزی نے نظم کو شاہکار بنا دیا ہے۔آپ نے اس نظم کو خیالات کے تسلسل کے ساتھ یوں بیان کیا ہے کہ اظہار کی طرفگی اور گفتار کی شگفتگی اپنے اندر اثر آفرینی اور حلاوت لیے ہوئے ہے۔

محمد اقبال نجمی کے ہاں حمدِ خالقِ اکبر کرنے کے کئی انداز ہیں۔آپ کے ہاں ایک طرف جہاں حمدمیں عبدیت کا والہانہ اظہار، لگاؤ اور محبت ہے وہیں نعت مبارک میں عقیدت کا عاشقانہ رچاؤ اپنے بھرپور جوش میں نظر آتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسنِ تقویم کے رُتبے پر فائز کیا ہے اور بے شک اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔اس کی ہر تخلیق مکمل اور خوبصورت ہے۔انسان بھی

جب اس کی تعریف اور حمد و ثناء کرتا ہے تو وہ اس کے لیے خوبصورت الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات تخلیق کرتا ہے۔ حمدِ ربِّ عظیم میں تخلیق کار نے بڑے اچھوتے انداز میں اپنی تخلیق کو مکمل کیا ہے۔ اسی حوالے سے آپ کی اس نظم کا ایک حصہ دیکھیں۔

حق کے سب مرحلے، حق کے سب سلسلے
حق کو سمجھے ہیں جو، حق کے پیچھے ہیں جو
حق کی پہچان کو جاننے کے لیے
اک طلب، اک کسک، دل میں رکھتے ہیں جو
کامیابی ملے، کامرانی ملے، وہ ہی حق دار ہیں(۳۶)

مالک و خالق کی حمد و ثنا کرتے ہوئے اقبال نجمی نے ابھی تک ۱۰ کتابیں لکھی ہیں۔ پنجابی میں بھی حمدیہ کتاب اور پہلا پنجابی دیوان دینے میں آپ کو انفرادیت حاصل ہے۔ اسی طرح حمدیہ ہائیکو کی پہلی کتاب میں بھی آپ کواولیت حاصل ہے۔ ریاضِ حمد بھی اپنی نوعیت کی واحد اور پہلی کتاب ہے جو ایک ہی بحر میں لکھی گئی ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ حفیظ تائب، "پہلا حمدیہ مجموعہ" ،مشمولہ، "دلچسپ"، شمارہ ۱۶/۲۰۱۵، مدیر اعلیٰ، ڈاکٹر احسان اللہ طاہرؔ، گوجرانوالہ، ص ۲۲۸
۲۔ ارشد محمود ناشادؔ، ڈاکٹر، "حمد چراغ دلاں دا چانن" پر ایک نظر، مشمولہ، "چانن دا ونجارا" مرتب: ڈاکٹر احسان اللہ طاہرؔ، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۷۹
۳۔ اکبر علی غازی، "پنجابی ادب وچ حمدیہ شاعری دا پہلا پراگا"، مشمولہ، "چانن دا ونجارا"، ص ۶۴
۴۔ نجمیؔ، محمد اقبال، نغمہء حمد، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۰۵ء، ص ۳۶
۵۔ ایضاً، ص ۱۳۳
۶۔ ایضاً، ص ۱۵۳
۷۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، "اصنافِ ادب"، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء ص ۸۵

۸۔ نجمیؔ، محمد اقبال ، نغمہء حمد"، ص ۱۲۹
۹۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، "اصنافِ ادب"، ص ۱۰۵
۱۰۔ نجمیؔ، محمد اقبال نجمیؔ ،ریاضِ حمد"، ص ۱۵۳
۱۱۔ محمد اکرم رضا، پروفیسر، دیباچہ، "اُچی ذات کمالاں والی"، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی گوجرانوالہ، ص ۸
۱۲۔ نجمیؔ، محمد اقبال، "اُچی ذات کمالاں والی"، ص ۳۰
۱۳۔ بشیر عابد، "پنجابی وچ حمدیہ قصیدیاں دا پہلا مجموعہ"، مشمولہ، "چانن دا ونجارا"، ص ۲۳
۱۴۔ نجمی، محمد اقبال، "اُچی ذات کمالاں والی"، ص ۶۶
۱۵۔ ایاز بشیر، "محمد اقبال نجمیؔ کی اردو شاعری کا فکر و فنی جائزہ"، مقالہ، ایم فِل، غیر مطبوعہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۶۶
۱۶۔ نجمی، محمد اقبال، "ریاضِ حمد"، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۹ء، ص ۵۵
۱۷۔ ایضاً، ص ۷۹
۱۸۔ ایضاً، ص ۶۳
۱۹۔ ایضاً، ص ۷۵
۲۰۔ نجمی، محمد اقبال، "حمدیہ ہائیکو"، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۵
۲۱۔ ایضاً، ص ۳۰
۲۲۔ ایضاً، متفرق صفحات
۲۳۔ اصغر عابد، غزل، مشمولہ، "پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ"، مرتب، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۳
۲۴۔ نجمی، محمد اقبال، "اللہ سوہنا"، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۳
۲۵۔ ایضاً، ص ۷۸
۲۶۔ ایضاً، ص۱۱۷
۲۷۔ نجمی، محمد اقبال، "للہ الحمد"، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۴ء، ص

۲۸۔ ایضاً، ص

۲۹۔ نجمی، محمد اقبال، "میرا ادبی سفر۔ حمد و نعت کی طرف"، مشمولہ، "عطائے رب العالمین"، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۱

۳۱۔ بشیر عابد، ڈاکٹر، "حمدیہ ساقی نامہ، حمد و ثنا کا خوبصورت مجموعہء کلام"، مشمولہ، حمدیہ ساقی نامہ، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰

۳۲۔ نجمی، محمد اقبال، "حمدیہ ساقی نامہ"، گوجرانوالہ، فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۹ء، ص ۶۰

۳۳۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۶۳

۳۶۔ نجمی، محمد اقبال، "حمدِ ربِ عظیم"، گوجرانوالہ فروغِ ادب اکادمی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۵

ڈاکٹر محمد راشد حفیظ
شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ
ڈاکٹر محمد شہباز
شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ
ڈاکٹر علی احمد
کامسیٹس یونیورسٹی اسلام آباد، وہاڑی کیمپس

# ثانوی سطح پر پنجابی طلبہ کی انگریزی اور اردو میں تحریری اغلاط کا تقابلی جائزہ

## Comparative Analysis of Punjabi Students' Writing Errors in English and Urdu at Secondary Level

Pakistan is a multilingual country with more than 60 languages. It will not be wrong to say that out of these languages, Urdu and English, which did not originate in Pakistan, are the most powerful. Urdu is the national language while English is used as the official language of the country. Both these languages are taught as compulsory subjects in our educational institutions. Punjabi is neither the official language nor is it taught as a subject in the schools. Both Urdu and English are taught from the primary up to the university levels as compulsory subjects. The aim of this study was to compare the English and Urdu errors of the Punjabi students at the secondary level.

**Keywords:** *Multingual, Country, Languages, Originate, Compulsory, Educational, Punjabi, Primary.*

**تعارف:**

پچھلی صدی کے آغاز سے ہی لسانی تعلیم کی تحقیق میں مروجہ اصطلاحوں میں دولسانی تعلیم دولسانیت اور کثیر السانیت اہم اصطلاحات کے طور پر ابھری ہیں اور تب سے اب تک انہیں لسانی تحقیق میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اگر کسی شخص کو ایک سے زائد زبانوں پر ایک معقول حد تک مہارت حاصل ہے تو اسے دولسانی کہا جاسکتا ہے۔ دولسانی طلبا دو زبانوں میں مہارت رکھتے ہوئے دو مختلف ثقافتوں کے درمیان پائے جانے والے فرق اور تضاد سے بھی آگاہ رہتے ہیں۔ اسی بنا پر انگریزی استعمال کرنے والے ایسے دولسانی طلبا جن کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے ان

طلبا سے مختلف ہوتے ہیں کہ جن کی مادری زبان انگریزی ہے مگر انہیں کسی اور زبان پر عبور حاصل نہیں ہوتا (برسک اور ہرنگٹن، ۲۰۱۰)۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ ایک سے زائد زبانیں بولتا ہے (کک، ۲۰۰۲اور ٹکر،۱۹۹۶)۔اس معاملہ میں پاکستان کو بھی استثنا حاصل نہیں۔

پاکستان ایک کثیر اللسانی ملک ہے جہاں لگ بھگ ۶۰ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ خواندہ پاکستانی تو دو زبانیں جانتے ہی ہیں ناخواندہ خواتین وحضرات کی اکثریت بھی کم از کم دو زبانوں سے واقفیت رکھتی ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں بولی جانے والی ۶۰ زبانوں میں سے دو زبانیں، انگریزی اور اردو، جن کا آغاز پاکستان میں نہیں ہوا ہی سب سے زیادہ طاقتور ہیں تو غلط نہ ہو گا۔ ہماری قومی زبان اردو ہے جبکہ انگریزی سرکاری زبان کے طور پر رائج ہے۔ یہ دونوں زبانیں ہمارے تعلیمی اداروں خصوصاً اسکولوں میں لازمی مضامین کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ پنجابی زبان نہ ہی سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے اور نہ اسے سکولوں میں ایک درسی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں ابتدائی درجات سے جامعات کی سطح تک لازمی مضامین کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی غالب زبان اردو ہے جبکہ چند ایک اخبارات اور رسائل انگریزی زبان میں بھی طبع ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان کا علم اچھی نوکری کے لیئے ضروری سمجھا جاتا ہے کیونکہ انگریزی نہ صرف مقابلے کے امتحانات کی زبان ہے بلکہ اعلیٰ'عدلیہ، قانون اور آئین کی زبان بھی سمجھی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود ہے کہ دستورِ پاکستان (۱۹۷۳) کے تحت اردو ملک کی واحد سرکاری زبان ہونا قرار پائی تھی۔

اردو اور انگریزی کی تدریس کے بارے میں کوئی بھی تحقیق اس مخصوص تناظر سے ہٹ کر کرنا ممکن نہیں۔ مگر یہ واحد لازمی تناظر نہیں ہے کیونکہ بہت سے دوسرے عوامل بھی اس میں کارفرما ہیں۔ زیرِ نظر تحقیق کیلئے سب سے اہم پس منظر لکھنے کے عمل میں کی جانی والی غلطیوں کے جائزے پر تحقیق ہے۔

**پس منظر:**

جائزہ اغلاط کی اصلاح زبان لکھنے یا بولنے والوں کی طرف سے کی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی اور ان کی اصلاح کیلئیے استعمال کی جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ کی دہائی سے جائزہ اغلاط عملی لسانیات کا ایک اہم جزو ہے۔ کوڈر (۱۹۶۰) نے سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال کی۔ اس کے مطابق جائزہ اغلاط کے ذریعے ہم طلبہ کے ذہن میں پائے جانے والی اس فطری ترتیب کو جان سکتے ہیں جس کے ذریعے وہ زبان سیکھتے ہیں۔ اس کے نزدیک اغلاط کی فطرت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس سے ہمیں زبان سیکھنے کے عمل کے متعلق بھی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر محققین کا ماننا ہے کہ

تصحیح اغلاط ایک موثر طریقہِ تدریس کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب تک اساتذہ طلبہ کی اغلاط اور ان کی وجوہات سے واقف نہ ہوں تب تک وہ موثر انداز میں تدریس کا فریضہ سر انجام نہیں دے سکتے (الحیسونی، ۲۰۱۲)۔ کرسٹل (۲۰۰۳) کے مطابق، جائزہ اغلاط طلبہ کی جانب سے تحریر کردہ مواد کو لسانیات کے کسی بھی اصول کے تحت مطالعہ کرنے کا نام ہے۔

**تحریری مہارت کی اغلاط:**

لسانی اغلاط کے شعبہ میں بیرونی ممالک میں سب سے زیادہ کام تحریری مہارت کے شعبہ میں ہوا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ ہے کہ تحریر میں مہارت دراصل زبان کی معراج ہے۔ فنِ بیان کی اہمیت مسلمہ ہے چاہے یہ تحریری مہارت کی شکل میں ہو یا تقریری مہارت کی صورت میں۔ تحریری مہارت کا مطلب فقط الفاظ کی تحریر ہی نہیں بلکہ اپنے خیالات کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ قرطاس ابیض پر اس انداز میں پیش کرنا ہے جس سے پڑھنے والا لکھنے والے کے مافی الضمیر کو بغیر کسی مشکل کے سمجھ سکے۔ اس فن میں کمال تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب طلبہ محنتِ شاقہ کے عادی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کی طرف سے انہیں مکمل رہنمائی بھی حاصل ہو۔

**تحریری مہارت میں اغلاط کی اقسام:**

لسانی اغلاط کی تحقیق میں ایک اور اہم نکتہ اغلاط کی اقسام سے متعلق ہے۔ لالانڈے (۱۹۸۲) کے مطابق ایک طویل عرصے تک زبان سیکھنے کے باوجود چند طلبہ ایسے بھی ہیں جو تواتر سے ایک جیسی تحریری اغلاط کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قواعد و ضوابط کی اغلاط اس ضمن میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ طلبہ ایک لمبے عرصہ تک قواعد و ضوابط کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پاکستان میں مروجہ لسانی تعلیم کے تقریباً تمام طریقہ ہائے تدریس قواعد وضوابط کی تعلیم پر زور دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود طلبہ قواعد وضوابط کی غلطیاں کرتے ہیں۔ انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس میں یہ نکتہ شائد زیادہ نمایاں ہے۔ انگریزی کی تدریس کے لیئے اساتذہ اردو کا سہارا لیتے ہیں۔ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمہ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی قواعد وضوابط کے ذریعے طلبہ کو زبان سکھائی جاتی ہے۔ مگر یہاں ایک چیز مدِ نظر رہے کہ قوائد وضوابط کی اغلاط کے علاوہ بھی بہت سی دوسری اغلاط ہیں جن کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔

جیسا کہ براؤن (۲۰۰۰) اور رچرڈز (۲۰۱۵) کے مطابق، طلبہ عام طور پر دو قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک قسم کو بین اللسانی اغلاط جبکہ دوسری قسم کو درون اللسانی اغلاط کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے

بین اللسانی اغلاط ایک زبان کے دوسری زبان پر اثر انداز ہونے کی بنا پر واقع ہوتی ہیں جبکہ درون اللسانی اغلاط کا منبع زبان کو درست انداز میں نہ سیکھنے کا عمل ہے۔

**جائزہ اغلاط کے مراحل:**

جائزہ اغلاط کا عمل عام طور پر چار مراحل پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سب سے پہلا عمل معلومہ مواد کو جمع کرنے کا ہے۔ دوسرا عمل اغلاط کی نشاندہی ہے جس کے بعد اغلاط کو بیان کرنے اور ان کی تشریح کے عمل آتے ہیں (ایلس اور برخوزن، ۲۰۰۵)۔

**معلومہ مواد کو جمع کرنا:**

جائزہ اغلاط کے لیئے معلومہ مواد کے انتخاب کا سب سے درست طریقہ یہ ہے کہ اسے یا تو صرف تحقیق میں استعمال ہونے کے لیئے لکھا جائے یا پھر طلبہ نے اسے تعلیم کے دوران لکھا ہو۔ یہ درست ہے کہ بہت سے ماہرینِ لسانیات سمجھتے ہیں کہ فطری طور پر بولی یا لکھی جانے والی زبان ہی اس ضمن میں موزوں ہے مگر عملی لسانیات کے ماہرین کے مطابق تحقیق کے لیے، یا دورانِ تدریس لکھے جانے والے مضامین اس لیے زیادہ کارآمد ہوتے ہیں کہ جائزہ اغلاط کا اصل مقصد ہی طلبہ کی اغلاط کو جانچنا ہے تاکہ زبان سیکھنے کے عمل میں پائی جانے والی مشکلات کا درست انداز میں احاطہ کرنے کے بعد اس ضمن میں تدارک کی صورتیں ڈھونڈی جا سکیں۔ مزید برآں، تدریس کے عمل کے دوران حاصل کیا جانے والا معلومہ مواد بڑی صورت میں بھی سامنے لایا جا سکتا ہے (سبیسٹا اور سکوڈوا، ۲۰۱۲)۔

**اغلاط کی نشاندہی:**

اغلاط کی نشاندہی کیلئے عموماً کوئی مخصوص اور مروّجہ نظام استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں بہت سے طریقے مستعمل ہیں۔ عملی لسانیات میں جائزہ اغلاط کی دو اصطلاحات (ایرر اور مسٹیک) بہت معروف ہیں۔ اردو لغات ان دونوں الفاظ کے لیئے غلطی کا لفظ بتاتی ہیں۔ جائزہ اغلاط میں ایسی غلطی جو لسانی قواعد سے لاعلمی کی بنیاد پر کی جاتی ہے اسے ایرر سے منسوب کیا جاتا ہے جبکہ سہواً وقوع پذیر ہونے والی غلطی مسٹیک کہلاتی ہے کوڈر (۱۹۶۰)۔ کوڈر کا خیال ہے کہ عمل لسانیات کے ماہرین اور زبان کے اساتذہ کو چاہئے کہ وہ اپنی زیادہ توجہ لاعلمی کی بنیاد پر کی جانی والی اغلاط پر رکھیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اساتذہ کو دونوں قسم کی اغلاط پر توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ بسا اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی غلطی سہواً سرزد ہوئی ہے اور کون سی زبان کے قواعد سے ناآشنائی کی بنا پر (ایلس اور برخوزن، ۲۰۰۵)۔

**بیانِ اغلاط:**

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تیسرے مرحلے میں اغلاط کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں زمرہ جاتی بنیادوں پر اغلاط کی تقسیم بھی شامل ہے اور مختلف زمروں میں اغلاط کی تکرار بھی۔ اس ضمن میں چند اصولِ صنف بندی بھی وضع کیے گئے ہیں۔ ان میں دو اصولِ صنف بندی زیادہ مستعمل ہیں۔ پہلے کو لسانی اصولِ صنف بندی کہا جاتا ہے جب کہ دوسرے کو سطحی ساخت کا اصولِ صنف بندی کہتے ہیں۔ لسانی اصولِ صنف بندی کا تعلق قوائد و ضوابط سے ہے جب کہ سطحی ساخت کا اصولِ صنف بندی زبان کی ساخت سے متعلق ہے، اور اس سے مراد اضافت یا حذف کرنے والی اغلاط ہیں جن کی بنا پر معانی و مفہوم صحیح انداز میں قاری تک نہیں پہنچ پاتے۔

**تشریحِ اغلاط:**

تشریحِ اغلاط جائزہِ اغلاط میں سب سے آخری مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ کا مقصد یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ جو غلطیاں طلبہ نے کی ہیں ان کی وجوہات کیا ہیں۔ دراصل اس سے اساتذہ اوور محققین کو یہ جاننے میں بھی مدد ملتی ہے کہ زبان سیکھنے کے عمل میں طلبہ کن طریقوں کا استعمال کر رہے ہیں۔

اوپر بیان کئے گئے مراحل میں گیس اور سلینکر (۲۰۰۵) نے دو مزید مراحل کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے بقول، اغلاط کو گننا اور ان سے بچاؤ کے طریقے بیان کرنا بھی جائزہِ اغلاط کا حصہ ہے۔

**اغلاط کو گننا:**

اس مرحلہ میں کسی مخصوص زمرہ میں وقوع پزیر ہونے والی اغلاط کو گنا جاتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ کس زمرے میں اغلاط کی تعداد زیادہ ہے۔ زیرِ نظر تحقیق میں مرحلہ کی اہمیت یوں بھی ہے کہ چونکہ اس تحقیق میں دو مختلف زبانوں میں کی جانے والی غلطیاں زیرِ بحث ہیں تو یہ پتہ لگانا زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کس زبان میں کس قسم کی غلطیوں کی تعداد زیادہ یا کم ہے۔

**بچاؤ کے طریقے:**

تحقیق کا ایک بنیادی نکتہ ان مسائل کا حل بتانا ہوتا ہے جو دورانِ تحقیق ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جائزہِ اغلاط کا عمل بھی فقط نشاندہی تک محدود نہیں ہے۔ دراصل اس میں اساتذہ کو اغلاط سے بچاؤ کے طریقے بھی بتائے جاتے ہیں۔

## طریقہِ تحقیق:

دورانِ تحقیق ۵۰ طلبہ سے معلوماتی مواد اکٹھا کیا گیا۔ تمام طلبہ کو ایک مضمون، ایک کہانی، اور ایک عرضی انگریزی اور اردو میں لکھنے کو دی گئیں۔ اس تحریری امتحان کا دورانیہ ۹۰ منٹ تھا۔ تمام مسودات کا درج بالا طریقہ کار برائے جائزہِ اغلاط کے تحت مطالعہ کیا گیا۔ سب سے پہلے تمام مسوادت کی پڑتال کی گئی، جس میں اغلاط کی نشاندہی کی گئی۔ اس کے بعد زمرہ جاتی بنیادوں پر اغلاط تقسیم کی گئیں۔ چوتھے مرحلہ میں ہر زمرے میں پائی جانے والی اغلاط کو گنا گیا۔ اگلے مرحلہ میں اغلاط کی وجوہات جاننے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد ان اغلاط کے تدارک کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی۔

## نتائج:

دونوں زبانوں کے مسودات کی اغلاط کو علیحدہ علیحدہ جدولوں میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ جس کے بعد اغلاط کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ذیل میں دیے گئے جدول سے ظاہر ہے، انگریزی زبان کے مسودات میں درج ذیل اغلاط سامنے آئیں۔

پنجابی طلبہ کے انگریزی مسوادت میں پائی جانے والی سب سے زیادہ اغلاط

Most Common Errors Found in the English Manuscripts of the Secondary Level Punjabi Students

**جدول نمبر ا**

**بڑے حروفِ تہجی کی اغلاط**

**Table 1**

**Capitalization Errors**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules |
|---|---|---|
| Capitalization Errors | When He entered the room ..... | "He" is not a proper noun. Therefore, its |

| | | |
|---|---|---|
| first letter should not be capitalized.<br>فقرہ کے آغاز کے علاوہ اگر اسم ضمیر کسی اور جگہ استعمال ہو رہا ہو تو اس کا آغاز بڑے حروفِ تہجی سے نہیں کیا جائے گا۔ | | بڑے حروفِ تہجی کی اغلاط |

مندرجہ بالا جدول سے ظاہر ہے کہ طلبہ بڑے حروفِ تہجی کی اغلاط تواتر سے کرتے ہیں-معلوماتی مواد کے مطابق تقریباً آدھے طلبہ اس قسم کی اغلاط کرتے ہیں-اس ضمن میں یہ نکتہ مدِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اردو زبان میں حروفِ تہجی ایک ہی انداز میں لکھے جاتے ہیں اور کسی اسم کی ابتدا بڑے حرف سے نہیں ہوتی۔ دراصل اردو زبان میں بڑے یا چھوٹے حروفِ تہجی جیسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس انگریزی میں capitalization کے واضح قواعد موجود ہیں، اور بعض اوقات ان کا غلط استعمال سے معانی بھی بدل جاتے ہیں۔

**جدول ۲**

**Table 2**

**Verb (Tenses)**

| Error Definition and Classification<br>غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors<br>اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules<br>قوائد |
|---|---|---|
| Verbs (Tenses)<br>زمانے کے لحاظ سے فعل کی اغلاط | He did not came there. | We do not use second form of the verb in past tense in negative sentences.<br>زمانہِ ماضی سے متعلق منفی فقرہ میں فعل کی ماضی حالت استعمال نہیں کی جاتی |

اس جدول سے ظاہر ہے کہ طلبہ زمانے کے لحاظ سے فعل کی اغلاط کرتے ہیں۔ انگریزی زبان میں زمانہِ ماضی کو بیان کرنے کے لیئے فعل ماضی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اگر فقرہ منفی ہو تو امدادی فعل ماضی کی شکل اِختیار کر لیتا ہے جبکہ اصل فعل ایسی صورت میں حال کے طور پر آتا ہے۔ جدول 1 میں بیان کیے گئے اصول کی طرح یہ اصول بھی اردو زبان میں نہیں پایا جاتا۔ مگر یہ صورتِ حال جدول 1 میں بیان کی گئی صورت سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ انگریزی میں بڑے حروفِ تہجی پائے ہی نہیں جاتے جبکہ اردو زبان میں فعل ماضی فعل حال اور امدادی فعل تینوں پائے جاتے ہیں مگر ان کے استعمال کا طریقہِ کار انگریزی زبان سے مختلف ہے۔

**جدول۳**

**Table 3**

**Verb (Subject Verb Agreement)**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| Verbs (Subject Verb Agreement) فاعل کے لحاظ سے فعل کی اغلاط | All the students comes to the class in time. | We do not use s/es with the first form of the verb if the subject is plural. زمانہِ حال میں واحد صیغہ غائب کی صورت میں فعل کی پہلی حالت کے ساتھ انگریزی حروف (s) یا ای ایس (es) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ |

اس جدول سے ظاہر ہے کہ طلبہ فاعل کے لحاظ سے فعل کی اغلاط کرتے ہیں۔ انگریزی زبان کے قواعد کے مطابق، زمانہ حال میں اگر فاعل غائب صیغہ واحد ہو تو فعل کی پہلے حالت کے ساتھ اضافی ایس (s) یا ای ایس (es) لگائے جاتے ہیں۔ انگریزی اورر اردو دونوں زبانوں میں فعل بمطابق فاعل بدلتا ہے۔ اردو میں اس لحاظ سے زمانے کی کوئی قید نہیں۔ فاعل کا صیغہ اگر رجمع میں ہو تو اس کے لیے فعل کی حالت بمطابق صیغہ واحد سے مختلف

ہو گی۔ یہاں مگر ایک نکتہ ذہن میں رہے کہ اردو زبان میں آداب کے تناظر میں فاعل کے لئے جمع کا صیغہ اس وقت مستعمل ہوتا ہے جب فاعل کی طرف عزت اور احترام دکھانا مقصود ہو۔ اس ضمن میں انگریزی اور اردو اساتذہ کی آراء جدول نمبر ۱۰ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

**جدول ۴**

**Table 4**

**Spellings**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| Spellings ہجے | Companys | In words ending in y preceded by a consonant, we remove y and add ies to make plurals ایسے الفاظ جو حرف y پر ختم ہو رہے ہوں، اور حرف y سے پہلے کوئی حرفِ صامت آتا ہو، میں حرف y کو حذف کر کے esi کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ |

انگریزی زبان میں ہجوں کی غلطیاں کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہی۔ درج بالا جدول اس امر کا عکاس ہے کہ جن چند طلبہ نے ہجوں کی غلطیاں کی ہیں انہوں نے بھی ایسا تکنیکی وجوہات کی بنا پر کیا ہے۔ دراصل اردو اور انگریزی دونوں میں جمع صیغہ کے لئے چند مستثنیات ہیں جنہیں ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اوپر دیا گیا اصول بھی ان میں سے ایک ہے۔ اساتذہ کے بقول، زیادہ تر طلبہ اس امر سے خائف رہتے ہیں کہ انگریزی زبان کے ہجوں کے اصول مستقل نہیں ہیں اور تلفظ اور ہجوں میں پائی جانے والی عدم مطابقت کی بنا پر یہ اغلاط سرزد ہوتی ہیں۔

**جدول ۵**

**Table 5**

**Collocations**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| Collocation ترتیبِ الفاظ | Strong fever | Adjectives that collocate with fever to express its degree are high and raging. There is nothing like a high fever. fever اسم (بخار) ہے اور اس کے لئے اسم صفت high سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ اس کے علاوہ raging بھی استعمال ہو سکتا ہے مگر strong استعمال کرنا غلط ہے۔ |

لفظ زبان کا لازمی جزو ہے اور زبان سیکھنے اور بولنے میں اس کی حیثیت مسلمہ ہے۔ مگر الفاظ کی درست ترتیب ہی بامعنی جملوں میں منتج ہوتی ہے۔ درج بالا جدول اسی امر کی عکاسی کرتا ہے۔ درج بالا غلطی سے ظاہر ہے کہ اگرچہ طلبہ اس امر سے واقف ہیں کہ بخار کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے اسم صفت کا استعمال لازمی ہے مگر فقط یہی علم اس ضمن میں کافی نہیں۔ اساتذہ کے بقول، ترتیبِ الفاظ کے بارے میں علم اور اس کی صحیح مشق ہی طلبہ کو اس غلطی سے بچنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

درج بالا جدول انگریزی زبان کی اغلاط سے متعلق تھے۔ ذیل میں دیئے گئے جداول میں اردو زبان میں کی جانے والی اغلاط پر روشنی ڈالی جائے گی جس کے بعد بحث کے حصہ میں ان دونوں کا ایک تقابلی جائزہ بھی پیش کیا جائے گا۔

**جدول٦**

**اسم ضمیر**

**Table 6**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| اسم ضمیر | میرے کو | اسم ضمیر واحد متکلم مفعولی کے لئے "مجھے" کا استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں "میرے کو" کی اصطلاح غلط ہے۔ |

معلوماتی مواد کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ طلبہ کو اسم ضمیر کے درست استعمال میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پنجابی زبان میں بھی ایسی کوئی اصطلاح نہیں جیسی درج بالا جدول میں غلطی کے زمرہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی وجوہات پر موجودہ مقالہ کے آخر میں بحث کی جائے گی۔ زیرِ نظر غلطی بہت سے طلبہ کے مسودات میں پائی گئی۔ جب اساتذہ سے اس ضمن میں سوال کیا گیا تو ان کی اکثریت کا خیال تھا کہ اس کی بڑی وجہ ہندی کارٹون اور ڈرامہ کا دیکھا جانا ہے۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد چونکہ ہندی کارٹون اور ڈرامے دیکھتی ہے تو اس طرح کی اغلاط کا سامنے آنا ایک فطری عمل ہے۔

**جدول ۷**

**اغلاطِ اختلاط**

**Table 7**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| اغلاطِ اختلاط | میرے والد کا ٹرانسفر دوسرے شہر ہو گیا ہے | اردو زبان میں انگریزی لفظ ٹرانسفر(transfer) کا متبادل تبادلہ ہے۔ اردو کی تحریر میں کوئی بھی لفظ کسی اور زبان سے صرف اس وقت مستعار لیا جاتا ہے جب اس کا اردو متبادل موجود نہ ہو۔ |

بین اللسانی اختلاط لسانی اغلاط کا ایک اہم منبع ہے خصوصاً ایسے حالات میں جب دو زبانیں ایک ہی وقت میں سیکھی جا رہی ہوں۔ درج بالا جدول میں بیان کی گئی غلطی ذخیرہِ الفاظ سے متعلق ہے۔ لیکن بین اللسانی اختلاط کی اغلاط محض ذخیرہِ الفاظ تک محدود نہیں۔ یہ بات بھی اساتذہ کے مشاہدہ میں آئی ہے کہ بعض اوقات طلبہ صرف و نحو کی اغلاط بھی اسی بنا پر کرتے ہیں۔ تاہم انگریزی کے اساتذہ نے بتایا کہ ایسی اغلاط کی تعداد کی اکثریت تلفظ اور تقریری عمل میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

**جدول۸**

**بین اللسانیت کی بنا پر ہجوں کی اغلاط**

Table 8

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| بین اللسانیت کی بنا پر ہجوں کی اغلاط | اُن کا اس سے کچھ واسطہ نہ تھا | اصل لفظ واسطہ ہے نا کہ داستہ |

زیرِ نظر جدول میں بیان کردہ مثال طلبہ کی اردو تحریروں میں بہت عام پائی جاتی ہے۔ اس غلطی کو محض ہجوں کی غلطی گردان کافی نہیں ہے۔ اگر پنجابی طلبہ کی ادائیگی الفاظ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ حرف کا غلط صوتی تاثر ہے۔ "ت" اور "ط" دونوں حروف کو پنجابی طلبہ عام طور پر ایک ہی انداز میں ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ غلطی بین السانی زمرہ میں شمار ہو گی۔ اسانذہ کے نزدیک، ہجوں کی اغلاط میں ایک بڑی وجہ لا پرواہی بھی ہے۔

**جدول۹**

**نحو یا جملوں کی ساخت سے متعلقہ اغلاط**

**Table 9**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| جملوں کی ساخت سے متعلقہ اغلاط | مشکل سے ہمارا گزارا ان کی قلیل آمدنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ | اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں پہلے اسباب بیان کئے جاتے |

| | | |
|---|---|---|
| ہیں اور اس کے بعد ان اسباب کے اثرات تحریر کئے جاتے ہیں۔ اس بناپر صحیح جملہ یوں ہو گا ان کی قلیل آمدنی کی وجہ سے ہمارا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے | | |

عام طور پر طلبہ کو اردو ذخیرہ الفاظ سے متعلق کم ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مزید بر آں، انہیں اردو صَرف کے درست استعمال میں بھی مشکلات پیش نہیں آتی۔ لیکن یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ طلبہ نحو کے معاملہ میں غفلت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ زیر نظر مثال بھی اسی امر کی عکاسی کرتی ہے۔ اساتذہ لے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبہ زیادہ وقت اردو لکھنے کی بجائے بولنے میں گزارتے ہیں اور بولتے ہوئے چونکہ قوائد کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تو وہی عادات تحریر میں بھی منتقل ہو جاتی ہیں۔

**جدول ۱۰**

**زمانے کے لحاظ سے فعل کی اغلاط**

**Table 10**

| Error Definition and Classification غلطی کی تعریف اور زمرہ | Example of Identification of Errors اغلاط کی نشاندہی (مثال) | Rules قوائد |
|---|---|---|
| فاعل کے لحاظ سے فعل کی اغلاط | اس نے کہا میں تمہیں ہزار دینار دو گا | زمانہ مستقبل کے لحاظ سے فائل واحد حاضر متکلم کے لئے اردو زبان میں "دوں گا" کا صیغہ درست ہے جبکہ "دو گا" کا صیغہ غلط ہے |

درون اللسان اغلاط میں فعل کی اغلاط بلحاظ فاعل بہت کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ فاعل واحد حاضر متکلم کے لئے پنجابی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں امدادی فعل مخصوص ہیں اور یہ غائب یا مخاطب کے لئے استعمال کئے جانے والے امدادی افعال سے مختلف ہیں۔ غلط استعمال کی بڑی وجہ غالباً زبان کو درست انداز میں نہ سیکھ پانا ہے۔ اس ضمن میں یاد رہے کہ کہ انگریزی تحریر میں بھی طلبہ فعل کی اغلاط بلحاظِ فاعل کے مرتکب ہوئے۔ اس تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ اردو تحریر میں طلبہ میں سے کسی نے بھی فعل کی اغلاط بلحاظِ زمانہ کا ارتکاب نہیں کیا جبکہ انگریزی تحریر میں بہت سے ایسے طلبہ سامنے آئے جنہوں نے ایسی اغلاط کیں۔

درج بالا نتائج سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کی تحریروں میں طلبہ زیادہ تر قواعد کی اغلاط کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اغلاط تو ایسی ہیں جو دونوں زبانوں کے لئے مشترکہ ہیں۔ مثلاً فعل کی اغلاط بلحاظ فاعل اور ہجوں کی اغلاط۔ لیکن اس کے علاوہ چند اغلاط دونوں میں سے کسی ایک زبان کی تحاریر میں دیکھی گئیں۔ انگریزی زبان کے طلبہ فعل کی اغلاط بلحاظِ زمانہ کا ارتکاب کرتے ہیں مگر یہ معاملہ اردو زبان کی تحاریر میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس کے علاوہ بڑے حروفِ تہجی کی اغلاط بھی انگریزی زبان تک محدود ہیں کیونکہ اردو زبان میں ایسا کوئی مسلہ درپیش نہیں ہوتا۔ مزید برآں انگریزی تحاریر میں ایک اور غلطی ترتیبِ الفاظ کی بھی ہے۔ اس ضمن میں ضرورت اس امر کی ہے طلبہ کو ان اغلاط سے بچاؤ کے لئے مشق کرائی جائے۔ جہاں تک اردو تحاریر کی مخصوص اغلاط کا تعلق ہے تو اسم ضمیر کی غلطیاں سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ جیسا کہ جدول نمر ٦ میں بیان کیا جا چکا ہے اساتذہ کی نظر میں ان اغلاط کا تعلق ہندی کارٹون اور ڈراموں سے ہے۔ اگرچہ ثقافتی یلغار اس تحقیق کا موضوع نہیں ہے مگر تحقیق کے دوران یہ بات ثابت ہوئی ہے ہندی ڈرامے اور کارٹون طلبہ کی اردو تحریر و تقریر کی صلاحیت پر اثرانداز ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں اساتذہ کی زمہ داری مزید بڑھ جاتی کہ وہ ثقافتی رویات کے امین ہوتے ہیں اور زبان ثقافت کا جزوِ لاینفک ہے۔ ایک اور نکتہ جس پر اساتذہ کو نظر رکھنے کی ضرورت ہے وہ بین اللسانی اور درون اللسانی اغلاط کا فرق ہے۔ اس تحقیق میں یہ بات بھی ابھر کر سامنے آئی ہے کہ اردو تحاریر میں پنجابی زبان کے اثر کی بنا پر ہجوں کی اغلاط بھی سرزد ہوتی ہیں۔ اگر اساتذہ شروع سے ہی طلبہ کو اردو اور پنجابی صوتیات سے واقفیت دلا دیں اور ان کا فرق بھی ذہن نشین کرا دیں تو ان اغلاط میں خاطر خواہ کمی لائی جا سکتی ہے۔

## حوالہ جات


1. Brown, H. (2000). Principles of Language Learning and Teaching. New Jersey: Prentice-Hall Inc Brisk, M. E., & Harrington, M. M. (2010). *Literacy and bilingualism: A handbook for all teachers*. Routledge.
2. Cook, V.J. (2002), 'Background to the L2 user', in V.J. Cook (ed.) *Portraits of the L2 User,* Clevedon, Multilingual Matters (2002), 1-28
3. Corder, S. P. (1967, January 1). The significance of learners' errors. International Review of Applied Linguistics, 5, 161-170.
4. Ellis, R., & Barkhuizen, G. (2005). Analysing Learner Language. China: Oxford University Press.
5. Lalande, J. (1982). Reducing Composition errors: An experiment. Modern language Journal, 66, 140-49. Accessed from http://dx.doi.org/10.1111/j.1540-4781.1982.tb06973.x.
6. Richards, J. C. (2015). Error analysis: Perspectives on second language acquisition. Routledge.
7. Tucker, G.R. (1996). Some thoughts concerning innovative language education programmes. Journal of Multilingual and Multicultural development 17 (2-4) 315-320 Retrieved April 20, 2006 from http://www.multilingual-matters.net/jmmd/017/0315/jmmd0170315.pdf
8. Gas, S. & Selinker, L. (2008). Second Language Acquisition: An Introductory Course (2nd edition). New York: Routledge.
9. Social Science Canadian Center of Science and Education, 8(12), 55- 66.

| نمبر شمار | مقالہ نگار | مقالے کا عنوان | موضوع |
|---|---|---|---|
| ۱. | ڈاکٹر شبنم نیاز/سحر مبین | سر سید احمد خان کی تعلیمی وسیاسی بصیرت اور عصری شعور | کسی بھی ملک کے سیاسی، سماجی، معاشی، ذہنی، ادبی،علمی اور ثقافتی رجحانات اس سرزمین کے حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔برصغیر کے معاشرے کی بھی یہی صورت حال تھی کہ یہاں کا معاشرہ مختلف قوموں میں بٹے ہونے کے ساتھ دو بڑی قوموں میں منقسم تھا۔ ایک مسلم معاشرت اور دوسری ہندو معاشرت یہ ہر دو بڑی قوتیں نہ صرف مذہب بلکہ تہذیب، زبان، عقائد،رسم و رواج،تاریخ اور طرز زندگی میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔یہ بڑا تفاوت ۱۸۵۷ءکی جنگ آزادی کے بعد ابھر کر سامنے آیا جس نے ہندوستان کی تاریخ ہی بدل دی۔ |
| ۲. | ڈاکٹر ارم صبا/ڈاکٹر شگفتہ فردوس | جدید اردو نظم میں اساطیری حوالے | اسطورہ، اساطیر اور دیو مالا کے لیے انگریزی زبان کا لفظ Mythاستعمال ہوتا ہے۔اساطیر کی جڑیں ما قبل تاریخ میں نہ جانے کب سےپیوست ہیں۔اساطیر کا ارتقاء دنیا کے مختلف علاقوں کے مختلف قبیلوں میں مختلف انداز سے ہوااور یوں ایک عجیب و غریب پر اسرار دنیا وجود میں آئی۔ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۳. | امجد رضا/ڈاکٹر طاہر عباس طیب | سرائیکی سہ حرفی موضوعاتی مطالعہ | کسی قوم کی سماجی تاریخ لوک ادب کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔لوک ادب ماضی کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ سی حرفی سندھی، پنجابی، اور سرائیکی میں یکساں مقبول صنف ہے۔صوفی شاعری کا ابتدائی ذخیرہ زیادہ تر سی حرفی کی شکل میں موجود ہے۔ سرائیکی سی حرفی توحید، عشق رسول، تصوف، دنیا کی بے ثباتی، حسن وعشق، اور اخلاقیات جیسے موضوعات کی بدولت منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ |
| ۴. | پروین صادق | عرب دنیا میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال | اردو زبان و ادب کی بنیادی جڑیں برصغیرپاک و ہند کی سر زمین میں ہیں۔لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔اردو زبان اپنےارتقائی مراحل میں تھی جب زمین عرب سے اس کا پودا نمودار ہوا۔ عرب ممالک میں اردو ادب کا بنیادی وجود کسی خاص نظریے کے تحت وجود نہیں آیا بلکہ پردیس میں دن بھر محنت مزدوری کرنے کے بعد جب اپنوں سے دوری کا احساس ستانےلگا تو ادب وجود میں آنے لگا ۔عرب دنیا میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال پر ایک نظر ڈالی جائے تو اردو ادب کا میدان۔ ہرا بھرا لہلہاتا اور سر سبز دکھائی دیتا ہے۔ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۵. | ڈاکٹر تحسین بی بی/اعظمی نورین | کلثوم افضل زیدوی کے شعری مجموعہ 'سنگتارے' کا فکری مطالعہ | ضلع صوابی کے شعرا اور اردو ادیبوں نے اردو اور پشتو شاعری کی مختلف اصناف پر لکھا ہے۔ان کی اردو شاعری بہت مشہور ہے۔ان شعرا میں سے ایک اہم نام کلثوم افضل زیدوی کا ہے۔انہوں نے اردو غزل ، نظم ، رباعی اور نثری موضوعات پر کام کیا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ "سنگترے " ہے جس میں اردو غزل،نظم، رباعی اور قطعہ شامل ہے۔زیر نظر مقالے میں کلثوم افضل زیدوی کے مجموعہ کلام اور ان کے شعری موضوعات پر ایک تفصیلی اور جامع نظر ڈالی گئی ہے۔ |
| ٦. | محمد ناصر آفریدی/ انجم یوسف | ڈاکٹر ارشاد شاکرؔ اعوان کی نظموں کا موضوعاتی مطالعہ | ارشاد شاکر اعوان خیبر پختونخوا کے ہزارہ ڈویژن میں سے ایک بہت مشہور شخصیت ہیں۔انہوں نے اردو شاعری میں نظم اور غزل کی صنف میں طبع آزمائی کی وہ اردو شاعری پر کمال دسترس رکھتے ہیں۔جس میں نعت نگاری بھی نمایاں پہلو ہے۔ان کی اردو شاعری کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں مختلف فکری پہلو وموضوعات موجود ہیں ان کی اردو شاعری میں نظم کے موضوعات اقبال کے نظریہ خودی سے خاص طورپر متاثر ہیں۔زیر نظر مقالے میں ارشاد شاکر کی اردو شاعری میں موجود فکر اور موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے تا کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۷. | ارشد محمود/ڈاکٹر محمد اسماعیل بن عبدالسلام | عربی شعرا کے قتل کے اسباب (عہد جاہلیت تا عہد عباسی) | عربی ادب اپنی دو بڑی اقسام کے ساتھ ابھرا۔ شعر اور نثر، یہ اپنے بیاناتی انداز سے ممتاز ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے اور ان کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ عربی ادب میں شاعری کو سب سے قدیم شکل تصور کیا جاتا ہے۔ عربی شاعری کا ارتکاز اسلام سے پہلے دور کی طرف جاتا ہے۔ اس دور کی عربی شاعری اس کی اصلیت اور زندگی کی ایک حقیقی تصویر سے نمایاں ہے۔ جو کچھ شاعر نے معاشرے اور ماحول سے مشاہدہ کیا ہے اس نے اپنے خیال کو شاعری کی شکل میں پیش کیا۔ عربی شاعری کے موضوعات میں: مدح، غزل، طنز ، ہنسی اور شہوت انگیزی وغیرہ شامل ہیں۔ |
| ۸. | ڈاکٹر نقیب احمد جان/منزہ مبین | ٹالسٹائی کی منتخب کہانیوں میں فکری سطح پر معاصر روسی تمدن کی بازیافت | ادب زندگی کا ترجمان اور ادیب معاشرے کا شاہد و ناقد ہوتا ہے۔ ہر ادیب کی تخلیقات میں اس کے معاصر تہذیب و تمدن اور معاشرت کا عکس نظر آتا ہے۔ کہانی کار افسانوی انداز میں اپنے معاصر معاشرے اور تمدن کے عکس کو اپنے قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ تخیل کی آمیزش سے حقیقت کو قاری کے ذوقِ نظر کے مطابق ڈھال کر اسے اس کے لیے قابلِ مطالعہ بناتا ہے اور نہایت چابک دستی سے اس میں اپنی رائے سمو کر قاری کو اپنا ہمنوا بنانے کی سعی کرتا ہے۔ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۹. | شکیل حسین سید | ڈاکٹر انوار حمد کی افسانہ نگاری | ڈاکٹر انوار احمد اردو افسانہ کے نقاد ہونے کے ساتھ بحیثیت افسانہ نگار بلند پایہ اور منفرد فنکار ہیں۔ ان کی کہانیاں جہاں قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی نسل کی بے چینی سیاسی و معاشرتی منظر نامے کے ساتھ، ترقی یافتہ ممالک کی تہذیب و معاشرت کو اُجاگر بھی کرتی ہیں۔ان افسانوں کے اندر جدید انسان کی اپنی تہذیب و ثقافت اور روایات سے جذباتی تعلق کی محرومی اور سماجی و معاشی جبر کی بدولت فرد کے بڑھتے ہوئے احساس تنہائی، داخلیت پسندی بے حسی اور لاتعلقی ابھر کر سامنے آئی ہے۔ جس کے پس پردہ معاشی، سیاسی ،سماجی، مذہبی اور اخلاقی و نفسیاتی عوامل کارونما ہوتے ہیں۔ |
| ۱۰. | مہناز انجم | نصیر احمد ناصر کی نظموں میں جدید دور کے مسائل | اسّی کی دہائی میں جن نظم نگاروں نے اپنی شناخت بنائی،اُن میں نصیر احمد ناصر ایک اہم نام ہے۔ ”دسمبر اب مت آنا“،نصیر احمد ناصر کا اوّلین مجموعہ کلام ہے۔یہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔اِس کے بعد آزاد نظموں پر مشتمل اُن کے چار مجموعے“عرابچی سو گیا ہے”، “پانی میں گم خواب” اور “ملبے سے ملی چیزیں” اور “سرمئی نیند کی بازگشت” شائع ہو چکے ہیں۔ |
| ۱۱. | عثمان غنی رعد / محمد ابرار صدیقی | سیرت رسولِ صادق کا تجزیاتی مطالعہ | آپؐ کی زندگی کے بارے میں لکھنا نہ صرف ایک ثواب اور جزاکاکام ہے بل کہ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | ایک انتہائی اہم ذمے داری بھی ہے۔اسی لیے مسلمان و غیر مسلم ہر کوئی آپؐ کی زندگی پر قلم اٹھانے سے پہلے نہایت عقیدت کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید میں بھی حاذقانہ رویہ اپناتا ہے نہیں تو اس نازک معاملے میں جزا کےبجائے سزا کا بھی احتمال رہتا ہے۔اس مضمون میں علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کی سیرت"رسولِ صادقؐ" کا تجزیہ پیش کیا گیاہے۔ |
| ۱۲. | ڈاکٹر صائمہ نذیر/ حامد محمود | محمد طفیل کی خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کے عناصر | اردو کے غیر افسانوی نثری ادب میں خاکہ نگاری سوانحی اصناف میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اردو رسائل کا ایک نیا دور شروع ہوا اور نئے مضامین اور موضوعات کی طرف ادیبوں کے قلم چلنے لگے تو جہاں افسانوی نثر میں تبدیلی آئی اور سوانحی ادب میں بوریت اور طوالت کو کم کرنے کی طرف ایک رجحان شروع ہوا۔اسی دور میں اردو کی نئی اصناف نے ظہور پایا۔ |
| ۱۳. | محمد ابرار ارشد/ ڈاکٹر محمد افضال بٹ | ظفر علی خان کے اخبارات و رسائل: تحقیقی مطالعہ | مولانا ظفر علی خان اردو ادب اور اردو صحافت کا نہایت معتبر نام ہیں، انھوں نے اردو صحافت کو نئی بلندیوں سے روشناس کروایا۔ ظفر علی خان کی ادبی وصحافتی زندگی کی ابتدا ان کے قیام حیدر آباد دکن سے ہوئی۔ مولانا کے سب سے پہلے رسالے کا نام " افسانہ " تھا، اس رسالے کے اجرا کا مقصد مغربی افسانوی ادب کے تراجم کی |

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | اشاعت تھا۔ مولانا کی علمی شخصیت کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان کے ذوق کی تسکین صرف تراجم کی اشاعت سے نہیں ہو سکے گی لہذا انھوں نے رسالے " دکن ریویو" کا اجرا کیا۔ |
| ۱۴. | احسان اللہ طاہر / بابر حسین | محمد اقبال نجمی کی حمد نگاری | عہدِ حاضر میں حمد کو موضوعِ سخن کے طور پر یوں لکھا گیا ہے کہ اسے صنف ِادب کے طور پر بھی تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ خالصتاً حمد کے مجموعے اردو اور پاکستان کی مقامی زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ محمد اقبال نجمیؔ نے ہائیکو میں اردو کی سب سے پہلی حمدیہ کتاب" حمدیہ ہائیکو" کے نام سے لکھی۔ اس کے علاوہ پنجابی ادب میں ان کا پہلا حمدیہ مجموعہ شائع ہوا جس کا نام "حمد چراغ دلاں دا چانن "تھا۔پنجابی کے پہلے حمدیہ دیوان کو بھی آپ ہی نے تخلیق کیا۔اس مضمون میں ان کی صنفی، ہیئتی اور فنی حوالے سے حمد کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے ادب میں انہوں نے فکری حوالے سے جو گہرے نقوش ثبت کیے ہیں، ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ |
| ۱۵. | ڈاکٹر محمد راشد حفیظ / ڈاکٹر محمد شہباز / ڈاکٹر علی احمد | ثانوی سطح پر پنجابی طلبہ کی انگریزی اور اردو میں تحریری اغلاط کا تقابلی جائزہ | پاکستان ایک کثیر اللسانی ملک ہے جہاں لگ بھگ ۶۰ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے دو زبانیں، انگریزی اور اردو، جن کا آغاز پاکستان میں نہیں ہوا ہی سب سے زیادہ طاقتور ہیں تو غلط نہیں ہو |

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | گا۔ ہماری قومی زبان اردو ہے جبکہ انگریزی سرکاری زبان کے طور پر رائج ہے۔ یہ دونوں زبانیں ہمارے تعلیمی اداروں خصوصاً اسکولوں میں لازمی مضامین کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ پنجابی زبان نہ ہی سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے اور نہ اسے سکولوں میں ایک درسی مضمون کی حیثیت حاصل ھے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں ابتدائی درجات سے جامعات کی سطح تک لازمی مضامین کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہیں۔ اس تحقیق کا بنیادی مقصد ثانوی سطح پر پنجابی طلبا کی انگریزی اور اردو اغلاط کا تقابلی جائزہ پیش کرنا ہے۔ |

**Patron–in- Chief:** Prof. Dr. Rukhsana Kausar, Vice Chancellor
**Parton:** Prof. Naila Arshad (Dean Arts & Social Sciences)
**Editor:** Dr. Muhammad Afzal Butt,
Chairperson Department of Urdu.
Coordinators: Dr.Sabina Awais / Dr. Shagufta Firdous/ Dr Tahir Tayib

**Advisory Board: (National)**

- Prof. Dr. Tahseen Faraqi, Director Majilas-e-Tarqiya Adab, Lahore
- Prof. Dr. Anwar Ahmad, Bahauddin Zakariya University, Multan.
- Prof. Dr. Rasheed Amjad, Ex-Dean Language & Literature International Islamic University, Islamabad.
- Prof. Dr. Muhammad Yousaf khushk, Dean Social Sciences, Shah Abdul Latif University, Khairpur (Sindh).
- Prof. Dr. Tanzeem-Ul-Firdous, Head Urdu Department, Karachi University, Karachi.
- Dr. Nasir Abbas Nayer, D.G Urdu Science Board, Lahore.
- Prof. Dr. Rubina Shahnaz, Head Urdu Department, National University of Modern Languages, Islamabad.

**Advisory Board (International)**

- Prof. Dr. Ibrahim Muhammad Ibrahim, Chairman Urdu Department, Al Azhar University, Egypt.
- Prof. Dr. Khalid Tauq Aar, Chairperson Urdu Department, Ankara University, Istanbul, Turkey.
- Prof. Dr. Khawaja Muhammad Ekramuddin, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India.
- Prof. So Yamane Yasir, Department of Area Studies, Osaka University, Japan.
- Dr. Muhammad Q. Marsi, Chairperson Urdu Department, Tehran University, Iran.
- Prof. Zhou Yuan, Head Urdu Department, Beijing Foreign Studies University, China.
- Dr. Timsal Masud, Department of Asian Studies The University of Texas at Austin.

**For Contact:** Department of Urdu, GC Women University, Sialkot

**Phone:**052-9250137-192-138 **Price:** Rs. 300

**Email**: tjurdu@gcwus.edu.pk **Website**: http://gcwus.edu.pk/tahqeeqijareeda

**ISSN: Print:** 2521-8204**, Online:** 2616-9681

*Research Journal*

# *Tahqeeqi Jareeda*

# 6

**July – Dec 2019**

**Department of Urdu**
**GC Women University, Sialkot**
**ISSN**
**Print: 2521-8204, Online: 2616-9681**

ISSN: Print: 2521-8204
Online:2616-9681
Issue: 6 July to December 2019

Research Journal

# TAHQEEQI JAREEDA

Department of Urdu
GC Women University, Sialkot